تصریحات و توضیحات تاریخِ پاکستان

پیر علی محمد راشدی

رُودادِ چمن

اسبابِ ہلاکتِ جمہوریت و عدمِ استحکام سیاست آئینی و عوامی



تصریحات و توضیحات تاریخِ پاکستان

رودادِ چمن

اسبابِ ہلاکتِ جمہوریت و عدمِ استحکامِ سیاست آئینی و عوامی

پیر علی محمد راشدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ

954.91 Pir Ali Mohammad Rashdi
Roodad-e-Chaman : Asbab-e-Halaqat Jamhoriat-o-Adam-e-Istehkam Siyasat Aaini-o-Awami / Pir Ali Mohmmad Rashdi.- Lahore : Sang - e - Meel Publications, 2002.
200p.
1. Tareekh - Pakistan. I. Title.

نئی نسل کے نوجوانوں کے نام

من نکردم شما حذر بکنید

2002.
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1325-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore 54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore Pakistan Phone 7667970

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ

یہ اُن تیئس (23) مضامین کا مجموعہ ہے جو مارچ 1982ء سے اگست 1982ء تک روزنامہ ''جنگ'' میں '' پُرانی اور بھولی ہوئی باتوں'' کی سرخی کے تحت شائع ہوتے رہے۔

ناظرینِ کرام کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کو اب کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

فہرست مضامین

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ

ہماری گاڑی کیوں اور کہاں پٹڑی سے اُتر گئی

قارئین کرام کا شدید تقاضا ہے کہ یہ جو میں کبھی کبھی بعض پرانے واقعات کی طرف اشارے کرتا رہتا ہوں تو کیوں نہیں ایک ہی بار کھل کر بتا دیتا کہ ہماری سیاست کی ریل گاڑی، میری اپنی معلومات کے مطابق کب پٹڑی سے اتر گئی، کس طرح اتری اور کون اس حادثہ کا حقیقی ذمہ دار تھا؟ ان کا خیال ہے کہ میں جانتا بہت کچھ ہوں مگر کسی وجہ سے بتا نہیں رہا ہوں۔

مجھے اپنی اس فروگذاشت کا پورا پورا احساس ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ 1920ء سے لے کر آج تک کے سارے سیاسی واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں، نہ صرف یہ مگر ان میں سے بعض کو وقوع پذیر ہونے اور بعض کو روکنے میں تھوڑا بہت میرا اپنا ہاتھ بھی رہا ہے۔ مجموعی طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے ہم عصر سیاستدانوں میں سے اکثر کی زیارت مجھے حمام میں حاصل ہوتی رہی۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر میں باتیں بتانے بیٹھوں تو میرا روئے سخن کس سے ہو؟ قوم سے؟ مگر وہ غریب تو 85 فیصد ناخواندہ ہے اور روزی کمانے اور زندہ رہنے کی فکر میں مبتلا۔ اس کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے پرانی تاریخ سننے یا تیس پینتیس برس پہلے کے واقعات پر سر کھپانے سے؟

باقی رہ گیا تھا پڑھے لکھے لوگوں کا وہ گروپ جو ہر چیز پر چھایا رہا تھا یا غور و فکر کرنے کا اہل تھا مگر وہ بھی تو کسی چیز کے سننے کے موڈ میں کبھی نہیں رہا۔ وہ بحالت

مدہوشی ناک کی سیدھ پر چلتا رہا۔ ماضی اور مستقبل دونوں کی فکر سے بے نیاز اس کی بغل میں دو بت چھپے رہے جن کی پوجا میں وہ مشغول رہا اور اپنا کام چلاتا رہا۔ وہ دو بت یہ تھے' جن کی شناخت اب بھی ضروری ہے۔

(1) شخصیت پرستی

کسی زندہ یا مردہ لیڈر کو اپنی عقیدت کا محور بنا لیا اور مصلحتاً اس کا دامن تھامے رہے کیونکہ اس طرح سے ان کے ذاتی کام بنتے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا (اور نہ ان کو یہ دیکھنے کی ضرورت تھی) کہ وہ لیڈر بھی ایک انسان تھا یا پیدائشی فرشتہ۔ اگر وہ سیاست یا انتظامیہ سے بھی منسلک رہا تو اس نے کبھی ٹھوکر بھی کھائی' کہیں مصلحتاً راستہ بھی بدلا' کہیں نامساعد حالات سے سمجھوتہ بھی کیا یا از ابتداء تا انتہا وہ حضرت خضر علیہ السلام کی ذاتی رہنمائی میں آب حیوان تک موٹر ریسنگ کرتا پہنچ گیا؟ منزہ عن الخطاء والنسیان؟

(2) ذاتی اغراض

یعنی جلد از جلد مال و دولت میسر ہو' پاور حاصل ہو' تعیش و تن آسانی کا سامان فراہم ہو' اخلاقی اقدار' خدا ترسی' انسانی ہمدردی اور ملک جائے بھاڑ میں۔ ان کا طریقہ کار بھی عجیب و غریب رہا۔ یعنی پہلے ملکی ذرائع کو لوٹو۔ اگر یہاں پیٹ نہ بھرے تو کسی دوسرے ملک بھاگ جاؤ۔ جلاوطنی کی حالت میں جس قدر بھی ذلت برداشت کرنی پڑے وہ برداشت کی جائے مگر روپیہ بنایا جائے۔ گویا اس بدقسمت ملک کا اس شخص کی خدمات پر کوئی حق ہی نہیں تھا۔ ملک کے اندر وہ پیدا ہوا۔ معاشرہ نے اس کی پرورش کی۔ اس کو پڑھایا' ہنر سکھایا۔ اس پر خرچ کیا اور اس کو ہاتھ پیر چلانے کے قابل بنایا اور جب یہ سب منزلیں طے ہو گئیں تو اس نے یہاں رہ کر اپنے ملک کی خدمت کرنا گوارا نہیں کیا بلکہ چند روپوں کی خاطر دوسروں کے کام آیا اور اپنے وطن کو یہ کہہ کر خوش کرتا رہا کہ میں آپ کو فارن ایکسچینج بھیج رہا ہوں۔ گویا اس ملک کے وجود کا مقصد ہی جلب زر ہے۔ اس کو اندرونی تعمیر کی کوئی ضرورت نہیں' یہ بردہ فروشوں کا ملک ہے' پرانے چین کی طرح قلی برآمد کر کے جیتا ہے۔ نان مرابدہ کفش برسر بزن (روٹی دو اور جوتا

مارو) کبھی جاپان اور جرمنی کی تاریخ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی...... ان ملکوں پر قریبی زمانے میں آفت آئی تھی اور اجڑ گئے تھے' مگر انہوں نے اپنی افرادی قوت ادھر اُدھر تتر بتر کر کے گزر اوقات کرنے پر اس بات کو ترجیح دی کہ ان کے اپنے آدمی اپنے ملک کے اندر رہ کر اس کی تعمیر نو میں ہاتھ بٹائیں کیونکہ جب تعمیر مکمل ہو جائے گی تو فارن ایکسچینج خود بخود دھڑا دھڑ آنا شروع ہو جائے گا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے بارے میں امریکہ اور یورپ کے ممالک بھی الامان والحفیظ کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ترکیب کسی کے خیال میں نہیں آئی جو شخص خود فی الحال ملک سے بھاگ نہیں سکا' اس نے بھی اپنے ٹبر کا ایک حصہ باہر کے ملکوں میں بکھیر دیا تاکہ جب یہاں کا کام تمام ہو جائے تو خود وہ بھی جا کر وہیں بیٹھ جائے۔

اب انصاف کیجئے کہ جو گروپ کسی نہ کسی شعبے میں سیاہ و سفید کا مالک ہو وہ اگر ان دو بتوں کی پوجا میں لگ جائے اور یہ طریقہ کار اختیار کر لے تو اس کو پرانی تاریخ بتانے سے کیا فائدہ؟ یہ پرانی باتیں کون سنے گا؟ ان سے استفادہ کون کرے گا؟ کس کا ضمیر اس قدر بیدار ہوگا؟ کس میں اس قدر ایمانی قوت ہو گی کہ وہ یہ باتیں سن کر حب الوطنی اور اجتماعی بہبود کی خاطر اپنے ذاتی اغراض بھول کر' حق کی دادرسی کرے گا؟

یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کی عقل اس قدر ماری گئی ہے کہ وہ نادانستہ اور غیر شعوری طور پر یہ بت پرستی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ بیسویں صدی کا انسان اس قدر سادہ لوح نہیں ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کی حقیقت نہ سمجھ سکے مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی بدقسمتی سے یہ راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

پس اس ماحول کی موجودگی میں بھی اگر قارئین کرام کا اصرار ہے کہ میں ضرور کچھ بتاؤں تو حاضر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہو گا مگر حکم ہے تو مفر بھی نہیں۔

ہماری تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کر دینا مناسب ہو گا۔ یعنی:

1- 1920ء سے 1940ء تک۔

2- 1940ء سے 1947ء تک اور

3- 1947ء سے 1971ء تک۔

ان میں سے پہلے دو ادوار فی الوقت غیر متعلق ہیں اور اس لیے خارج از بحث ہیں کہ آج تک ان پر کافی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً دو قومی نظریہ کا انکشاف کب ہوا؟ کس پر ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اس کو کن الفاظ میں عوام کے سامنے لایا گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص یا گروپ جو پاکستان کے دستر خوان پر اپنا استحقاق جتانا چاہتا ہے یہی دعویٰ کرتا رہا ہے کہ یہ انکشاف سب سے پہلے اس کے بزرگوں پر ہوا اور اسی بناء پر اس کا حق بنتا ہے کہ سب سے زیادہ لذیذ لقمہ وہ خود اٹھالے..... بالفاظ دیگر پاکستان اس کے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی میراث ہے۔ جس کا وہ تنہا وارث ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے کو اس دستر خوان سے روٹی کا ٹکڑا اٹھانے دیتا ہے تو یہ اس کا کرم ہے ورنہ حق وق کسی اور کا نہیں۔ اس ٹولے میں ایک عنصر ایسا بھی ہے جس کے بزرگوں نے شروع میں پاکستان اور دو قومی نظریہ کی تو مخالفت کی تھی مگر حالات بدل جانے کے بعد اب وہ بھی اغرم بغزم باتیں بنا کر اندر گھس کر سارے دستر خوان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

میرا اپنا عقیدہ اس بارے میں یہ ہے کہ دو قوموں والا نظریہ ایک فطری اور پرانی چیز ہے اور اس کا انکشاف ہندوستان میں اس وقت ہوا جب پہلے مسلمان نے یہاں قدم رکھا اور کافروں اور مسلمانوں کے بیچ میں خط تفریق کھینچ دیا۔ یہ لکیر بعد میں ہندوستان کے نقشے پر سے کبھی نہیں مٹی، بلکہ رفتہ رفتہ اور نمایاں ہوتی گئی۔ اس اثناء میں یقیناً ایسے دور بھی آتے رہے جب بعض سیاسی اور ملکرانی کی مصلحتوں کی وجہ سے اور تو اور خود حکمرانوں نے یہ کوشش کی کہ اس لکیر کو اس قدر مدھم کر دیا جائے کہ دیکھنے میں نہ آئے۔ (مثلاً دور اکبری یا مجمع البحرین کی تصنیف والا زمانہ) مگر اس کا مٹنا غیر فطری چیز تھی لہٰذا وہ نہیں مٹی۔ یعنی ہر اکبر کے بعد ایک عالمگیر بھی آتا رہا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

ظاہر ہے کہ قدرت کی کھینچی ہوئی لکیر انسانوں کی کوشش سے نہ مٹ سکی، نہ مدھم پڑ سکی۔ یہ ہر وقت ذہنوں میں موجود رہی اور جب بھی موقع آیا ابھرتی رہی۔ بس اس سیاق و سباق میں یہ سوچنا کہ اس کا خالق کون تھا یا کون نہیں تھا، بیکار ہے۔ اس کا خالق خود خالق ارض و سما ہے جس نے قرآن مجید اور اپنے رسول اکرم ﷺ کے ذریعہ اس فرق یا حد فاصل کو ہمیشہ کے لیے واضح فرمادیا۔

پاکستان کے دستر خوان پر سے جس کو موقع میسر آئے وہ لقمۂ تر اٹھالے، کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی روکنے والا نہیں صرف ایک احتیاط برتیں وہ یہ کہ آپ یہ دعویٰ نہ فرمائیں کہ ان نعمتوں کے خالق آپ کے بزرگ تھے، کیونکہ خالق ہر چیز کا وہی ہے یعنی خدائے عزوجل۔

آپ خوشی سے ایک دوسرے کے بال نوچیں۔ اقتدار کی جنگ لڑیں، بزور بازو جس چیز پر ہاتھ پڑے اٹھا کر جیب میں ڈال لیں، جس مستحق کا حق غصب ہو، کرلیں، تاریخ کی جتنی جھوٹی تاویلیں کر سکتے ہیں کرلیں اور اس قوم کے جینیس (GENIUS) کے بارے میں جو تھیوریاں لڑانی ہوں، وہ لڑالیں صرف خالق حقیقی کو اس کے صحیح مقام سے محروم کرنے یا پس منظر میں ڈال دینے کی کوشش نہ کریں، کیونکہ جن گروہوں نے یہ کیا وہ سخت عذاب میں مبتلا ہو گئے۔

جہاں تک موجودہ پاکستان کا تعلق ہے تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کا تصور بطور ایک سیاسی تجویز علامہ اقبالؒ نے دیا اور قائداعظمؒ نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔ رہا دو قومی نظریے کا مسئلہ، تو اس کا خالق خود خدا تعالیٰ ہے۔

1947ء سے پہلے کے دو ادوار کو ان مختصر ریمارکس کے ساتھ، اس وقت خارج از بحث قرار دینے کے بعد تیسرا دور 1947ء سے 1971ء تک کا ہی رہ جاتا ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ گاڑی کے پٹڑی سے اتر جانے والا حادثہ اسی دور ہی میں پیش آیا۔

قیام پاکستان سے چند سال پہلے کے حالات

میرا مقصد تو یہ ہے کہ میں اپنی تاریخ کے تیسرے دور (1947ء سے 1971ء تک) کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کروں مگر اس سے پہلے کے چند سال کے حالات سرسری طور پر بتا دینا اس لیے ضروری ہے کہ یہ پس منظر ہیں بعد کے واقعات کا اور اگر یہ ذہن میں محفوظ ہو گئے تو آگے کے واقعات سمجھنے میں کافی سہولت رہے گی۔

یاد رہے کہ ہم سندھ کے نوجوان مسلمان سیاسی کارکن 1930ء سے 1938ء تک آل انڈیا سیاست سے دور رہے تھے۔ سندھ کی طرف سے مرحوم سر عبداللہ ہارون اور شیخ عبدالمجید مرحوم اوپر کی سیاست میں دلچسپی لیتے رہے تھے اور ان سے پہلے مرحوم غلام محمد بھرگڑی اور چند دوسرے حضرات (خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کا کسی زمانے میں سندھ میں بھی زور رہا تھا مگر 1930ء تک وہ ختم ہو گئی تھیں۔)

جہاں تک سندھ کے ہندوؤں کا تعلق تھا تو ان کا تعلیم یافتہ طبقہ کانگریس اور مہاسبھا سے وابستہ تھا اور ان کے اخبارات ہم بھی پڑھتے رہتے تھے مگر یہ وہ زمانہ تھا جب اندرون سندھ ہندو مسلم فسادات ہو چکے تھے (اور اب بھی ہو رہے تھے) اور اس وجہ سے ہم ہندو کی سیاست اور انداز فکر سے شاکی تھے اور ان سے دور رہتے تھے۔ ہماری کوششیں یہ تھیں کہ کسی طرح سندھ کو بمبئی پریذیڈینسی سے نکلوا کر علیحدہ صوبہ بنالیں تاکہ یہاں کی مسلمان اکثریت کو ابھرنے کا موقع ملے اور ہندو کا زور ٹوٹ جائے۔ واقعہ

یہ تھا کہ بمبئی پریذیڈینسی میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جس کے بل بوتے پر ہمارے یہاں کے ہندو ہم پر دھونس جمائے رہتے تھے اور ہم اس تکلیف سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔

1936ء تک سندھ کی علیحدگی کی یہ تحریک چلتی رہی اور بالآخر اس سال کے شروع میں سندھ ایک علیحدہ صوبہ بن گیا جس میں 75 فیصد مسلمان تھے مگر جلد ہی تجربہ نے ثابت کر دیا کہ علیحدگی سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا کیونکہ ہندوؤں نے اب نئے حالات میں اپنی حکمت عملی تبدیل کر کے یہ طریقہ نکالا تھا کہ سندھ کے سیاسی وڈیروں کو آپس میں لڑا کر ان کے کسی نہ کسی گروپ کا ساتھ دے کر اور اس کو اپنا محتاج بنا کر اس طرح استعمال کیا جائے کہ سندھ کے مسلمان ان فوائد سے محروم رہیں جن کی خاطر انہوں نے یہ صوبہ بنوایا تھا۔

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ سندھ کے ہندو بالعموم آل انڈیا کانگریس سے وابستہ تھے اور ان میں سے بہت سارے تو کانگریس ٹکٹ پر ہی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو کر آئے تھے۔ اس نسبت سے ہم نے مقامی ہندوؤں کی بے جا روش کو رکوانے کے لیے اب کانگریس کے ہائی کمانڈ سے رجوع کیا اور حق و انصاف کا واسطہ دے کر ان سے اپیلیں کیں کہ وہ اس شوریدہ سری کا کوئی علاج کریں مگر ان سے کچھ عرصہ ٹال مٹول کرنے کے بعد انہوں نے یہ بھی مقامی ہندوؤں کی 'مسلمانوں میں تفریق ڈلوانے والی پالیسی کی تائید کر دی اور ہم ان سے ناامید ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

مقامی طور پر ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہاں کے ہندو کو عقل اور دوراندیشی کا راستہ دکھا کر راہِ راست پر لائیں اور ان کو مسلمان پڑوسیوں کا دل دکھانے سے باز رکھیں مگر ہماری نیک نیتی اور خیرسگالی اور عقل کی باتوں کو وہ ہماری کمزوری پر محمول کرتے رہے۔

میں نے انہی دنوں یہ محسوس کر لیا کہ جس فرد یا گروپ کے دماغ پر ایک مرتبہ طاقت کا نشہ طاری ہو جائے تو اس کی عقل اللہ تعالیٰ مار دیتا ہے اور وہ احتیاط دوراندیشی، حق اور انصاف کی بات سمجھ ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہی کچھ ہوتا رہا اور ہم ہندو کی ذہنیت سے قطعاً

دلبرداشتہ ہو گئے۔ ایک طرح سے ہم کو افسوس بھی ہوا کیونکہ سندھ کے بزرگ صدیوں سے انسان دوستی' خداترسی' محبت اور ملاپ کا درس دیتے آئے تھے اور ہم جو کچھ اب دیکھ رہے تھے وہ یہ تھا کہ ان کی کوششوں نے ہندوؤں کی نئی نسل پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔

بہرحال اب ان سے ہماری مایوسی مکمل ہو چکی تھی۔

انہی دنوں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کی خبریں آنے لگی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ کانگریس کا توڑ صرف یہی مسلم لیگ ہو سکتی ہے۔ مرحوم عبداللہ ہارون اور مرحوم شیخ عبدالمجید پہلے ہی مسلم لیگ کی طرف مائل تھے اور اب ہم جونیئر مسلمان سیاسی کارکن بھی لیگ کے دامن سے چمٹ گئے۔ ہم نے 1938ء میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس منعقد کروائی۔ قائداعظمؒ کو مدعو کیا۔ سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنائی۔ اندرون صوبہ مسلم لیگ کو منظم کیا۔ منزلگاہ والے مسئلہ پر ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کی۔ اپنے اوپر مقدمے چلوائے' جیلوں میں گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

چونکہ ہم لوگ سندھ میں کانگریس ذہنیت اور سیاست سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے لہٰذا ہماری سوچ میں' دوسروں کے مقابلے میں ذرا زیادہ تلخی آ گئی تھی۔ ویسے تو کانگریسی وزارتوں نے ہندوستان کے باقی صوبوں میں بھی مسلمانوں کے خلاف حد سے زیادہ اودھم مچا رکھا تھا مگر اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے ابھی کوئی چیز بطور کسی ٹھوس آئینی فارمولا کے' مسلم لیگ کی طرف سے پیش نہیں ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر کی باتیں تو بہت ہوتی رہی تھیں مگر ہندوستان کا بٹوارہ مسلم لیگ کا نصب العین بنے اور اس کو بطور مطالبہ پیش کر کے اس کے حصول کے لیے تحریک چلائی جائے' یہ منزل ہنوز نہیں آئی تھی۔

یہ کمی ہم سندھ والوں نے جو کانگریسیوں کے ہاتھوں تازہ زخم کھائے ہوئے تھے' کراچی کانفرنس کے موقع پر کسی حد تک پوری کر دی۔ ہمارے شیخ عبدالمجید مرحوم نے وہ تاریخی قرارداد پیش کر دی جو جلد ہی بنیاد بن گئی۔ بعض خاص خطوط پر' مسلمانوں کی سیاسی سوچ کی۔ اس کے بعد ہم سندھ والوں نے تقسیم کی تحریک میں عملی طور پر بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی تفصیلات یہاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا عرض

کر دینا کافی ہو گا کہ اس منزل کے بعد ہم دہلی سے دور رہنے والے بھی' جو اب تک آل انڈیا پالیٹکس سے کسی قدر لاتعلق رہے تھے' آل انڈیا سیاست بلکہ بین الاقوامی حالات کے بارے میں باخبر رہنے لگے اور جہاں تک ہمارے لیے ممکن تھا' تھوڑا بہت ان چیزوں میں حصہ لینے لگ گئے۔

جو اصلی چیز اس سلسلہ میں مضامین سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ کہ میں بتانا چاہتا ہوں کہ 1938ء میں جب میں مسلم لیگ تحریک سے وابستہ ہو گیا تو اس وقت میں نے کیا دیکھا؟ یعنی گردوپیش کے حالات کیا تھے؟ زندگی کیسے گزرتی تھی؟ سیاست کا حال کیا تھا؟ انگریز کیا کر رہا تھا؟ کانگریس میں کیا ہو رہا تھا؟ مسلمانوں کی سوچ کے انداز کیا تھے؟ بین الاقوامی حالات کس رخ پر جانے لگے تھے؟

ان حالات کو اس منزل پر بتا دینا اس وجہ سے مناسب ہے کہ انہی کے زیر اثر مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کی تشکیل ہوئی اور اس کی رفتار متعین ہوتی رہی۔

1- کانگریس کا بے انتہا زور تھا' اس نے طے کیا ہوا تھا کہ وہ سوراج قائم کرے گی جس کے معنی ہندو راج ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے صرف اتنی گنجائش رکھی تھی کہ وہ بطور ایک امن پسند اقلیت زندہ رہنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اقلیتوں سے وہ کیا سلوک کرنا چاہتی تھی اس کا اندازہ ان صوبوں میں ہو گیا تھا جہاں 1935ء والے آئین کے تحت اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنی حکومتیں بنائی تھیں۔

2- دوسری طرف مسلمان من حیث القوم غیر منظم تھے۔ حال ہی میں گو کہ انہوں نے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈال دی تھی اور قائداعظمؒ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے تھے' پھر بھی ان میں اندرونی اختلافات کافی تھے۔ ایک گروہ مسلمانوں کا براہ راست کانگریس میں تھا۔ علماء کی بڑی تعداد اور ان کی جماعتیں مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کی مخالف تھیں (سوائے دو چار مولاناؤں کے جو بے چارے اپنی شخصی حیثیت میں مسلم لیگ کی حمایت کرتے رہتے تھے) پنجاب اور بنگال میں مسلم لیگ کی وزارتیں تھیں اور ان کے سربراہ مزاجاً تو مسلم لیگ کے ساتھ تھے مگر عملاً ان کو اپنے صوبوں کے

مفادات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا جہاں غیر مسلم اقلیتیں کافی طاقتور تھیں۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب مرحوم کی کانگریس وزارت تھی اور سندھ میں خان بہادر اللہ بخش مرحوم کی نیم کانگریسی منسٹری۔ برصغیر کی تقسیم کا فارمولا جو ڈاکٹر محمد اقبالؒ الہ آباد میں پیش کر چکے تھے' وہ ہنوز مسلم لیگ کا نصب العین نہیں بنا تھا (یہ قرارداد بعد میں 1940ء میں منظور ہوئی اور ایک سال بعد مدراس سیشن میں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں داخل کر دی گئی۔) البتہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کا خیال اس طرف جانے لگا تھا' جیسا کہ کراچی کانفرنس کی قرارداد سے ظاہر ہوا۔

3- عالمی افق پر لڑائی کے بادل منڈلانے لگے تھے' مگر یہاں کسی کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد دوسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی جس کے نتیجہ میں انگریز اتنا کمزور ہو جائے گا کہ وہ چند سال کے اندر برصغیر کو آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

4- مگر ستمبر 1939ء میں لڑائی کا اعلان ہو گیا۔

5- لڑائی اور اس میں انگریز کے ابتلاء کی وجہ سے ہمارے یہاں روزمرہ کی زندگی میں کوئی ناقابل برداشت فرق نہیں آیا۔ عوام کے ساتھ 'انگریز نے لڑائی کے بہانہ سے کوئی خاص سختی نہیں برتی تھی۔ سیاسی لائف بدستور چلتی رہی۔ اخباری پروپیگنڈہ' دربند میٹنگیں' کھلے جلسے جلوس (اور کبھی کبھی ستیہ گرہ بھی) جاری رہے' عام زبان بندی نہیں ہوئی۔ یہ ہم اخبار والوں پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ ہم خود آپس میں مل کر فیصلہ کرتے رہیں کہ کس چیز کی اشاعت سے جرمنی کو فائدہ اور اتحادیوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے' چونکہ ہمارت عزت نفس پر ضرب نہیں پڑی تھی اور ہم کو رسمی طور پر غیر ذمہ دارانہ اور شرپسند نہیں قرار دیا گیا تھا۔ ہم نے بھی تعاون کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی' البتہ اس زمانے میں حکومت کی طرف سے ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے خوش خو اور میٹھی طبیعت کے افسر (مثلاً سندھ میں سید ہاشم رضا اور مرکز میں مجید ملک مرحوم) مقرر تھے جو ہماری مجبوریاں اور یہاں

کے عوام کی نفسیات خوب سمجھتے تھے۔ وہ صحافت پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتے تھے کہ سرے سے ہی اخبارات پر سے پبلک کا اعتماد اٹھ جائے اور ان کو انگریز کا چیتھڑا سمجھا جائے۔ ڈیفنس آف انڈیا رولز ضرور نافذ کر دیئے گئے تھے مگر ان پر اس قدر شدت سے عمل نہیں ہوا کہ حکومت عریاں ہو جائے۔ لوگ اس سے اکتا جائیں یا گھٹن محسوس کر کے لُو کی دعائیں مانگتے پھریں حتیٰ کہ گاندھی جی نے "انگریز ہندوستان سے نکل جاؤ" کا نعرہ بھی لگایا اور سول نافرمانی بھی شروع کر دی (اور کہیں کہیں تو لاء اینڈ آرڈر کے عملے سے جھڑپیں بھی ہوتی رہتی تھیں) پھر بھی انگریز نے ہندوستان کو کسی جنرل کی تحویل میں نہیں دیا۔ حالانکہ ایک خونخوار لڑائی چل رہی تھی۔ وہ کافی مصیبت میں مبتلا تھا اور خود ہندوستان براہ راست خطرہ میں پڑ چکا تھا کیونکہ جاپانی افواج بنگال کی سرحد میں پہنچ چکی تھیں۔ ایسے زمانے میں بھی اسمبلیاں معمول کی طرح کام کرتی رہیں۔ عدلیہ سے کوئی ہیرا پھیری نہیں ہوئی' نوکر شاہی کو کوئی ڈھیل نہیں دی گئی' قانون کا راج قائم رہا۔

6- لڑائی کی وجہ سے قیمتوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا۔ بلیک مارکیٹ ضرور شروع ہوئی تھی مگر اس قدر نہیں کہ زندگی کی ضروریات ناپید ہو جائیں یا ان کی قیمتیں اس قدر بڑھ جائیں کہ عوام میں بے چینی یا انتظامیہ کے خلاف نفرت پھیل جائے۔ بعض اشیاء کے لیے راشن بندی کا انتظام کر دیا گیا تھا اور اس انتظام میں رشوت خوری کی وجہ سے کوئی خاص رخنہ اندازی نہیں ہو رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ رشوت بھی اس دور میں برائے نام اور بہت ہی نچلی لیول پر تھی اور ساری انتظامیہ کے لیے ذلت اور بدنامی کا باعث نہیں بنی تھی۔ نوکر شاہی پر کنٹرول تھا' ان میں بنگلہ سازی اور بینک بیلنس بڑھانے کی وباء نہیں پھیلی تھی (ان غریبوں کے لیے ایئرکنڈیشنر بھی نہیں ہوتے تھے) ٹرانسپورٹ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ٹرینیں ٹائم پر چلتی تھیں اور ان میں کوئی بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ میں خود کراچی سے لاہور' دہلی' بمبئی' مدراس اور کلکتہ تک تھرڈ کلاس میں سفر کرتا رہا مگر کوئی تکلیف محسوس

نہیں ہوتی تھی۔ کراچی میں ٹرام چلتی تھی۔ صدر سے کیماڑی تک' کرایہ پہلے دو پیسے بعد میں ایک آنہ۔ مجموعی طور پر عوام اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

البتہ سیاسی لوگ سوچتے رہتے تھے کہ اس کے بعد کیا ہوگا اور اپنے پروگراموں کو آگے بڑھانے کے لیے تحریکیں بھی چلاتے رہتے تھے۔ عام آدمی متفکر یا مرجھایا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بول سکتے تھے' ہنسی مذاق کر سکتے تھے' ان کے چہروں پر مردنی چھائی نہیں رہتی تھی جس طرح کہ لڑائیوں کے دوران میں ہوتا تھا۔

7- جب پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو مسلم لیگ کے پاس کوئی فنڈ نہیں تھا۔ ہر شخص اپنی جیب سے خرچ کرتا تھا۔ ورکر اور لیڈر دونوں انتہائی ایماندار لوگ تھے۔ وہ سیاست میں اس لیے نہیں آئے تھے کہ حرام خوری کریں اور مالدار بنیں۔ ان کو دیکھ کر بہت لوگ دھوکہ کھا گئے کہ مستقبل میں بھی ہمیشہ یہی کیفیت رہے گی۔

8- باہر کے مسلمان ملکوں یا دوسروں نے مطالبہ پاکستان کے سلسلے میں یہاں کے مسلمانوں کی کوئی مدد نہیں کی حالانکہ ہم ان کے ہر معاملے کے بارے میں یہاں بیٹھے بیٹھے اپنے سر دیواروں سے ٹکراتے رہتے تھے۔ فلسطین ہو' ترکی ہو' جزیرۃ العرب ہو' شام ہو یا الجزائر ہو' غرض جہاں بھی مسلمانوں پر کوئی تکلیف آتی تھی' ہم چیخنے چلانے لگتے تھے مگر افسوس ہے کہ جب ہم پر وقت آیا تو کہیں سے کانگریس کے مظالم کے خلاف اور پاکستان کی حمایت میں کوئی آواز نہیں اٹھی۔ عبداللہ ہارون مرحوم مسلم لیگ کی طرف سے بحیثیت چیئرمین فارن کمیٹی ہر عید کے موقع پر مسلم فرمانرواؤں کی خدمت میں مبارکباد کے پیغام بذریعہ تار بھیجتے رہے مگر کسی نے رسید تک بھیجنے کی بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ جب پاکستان بن گیا تو اس وقت بھی پاکستان کے خلاف یو این او میں ووٹ ڈالنے والا ایک مسلمان ملک تھا۔ حیدر آباد مٹ گیا' مگر کوئی نہیں بولا' کشمیر پر ہندو نے قبضہ کر لیا مگر کسی برادر ملک کا

منہ نہیں کھلا۔ کانگریس اجلاس میں شرکت کے لیے ہندوؤں نے دعوت دی تو مصر نے وفد بھیج دیا۔ ہم نے لاہور سیشن کے سلسلہ میں دعوتیں بھیجیں تو کوئی نہیں آیا۔

9- مسلمانوں کے اخبار تھوڑے تھے' مگر خدمت کے لیے ہوتے تھے۔ مال و دولت اکٹھا کرنے کے لیے نہیں۔ صحافیوں میں خودداری اور عزت نفس کا جذبہ ہوتا تھا۔ سچ بولتے تھے اور حق کی بات کہتے تھے۔ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ جیل خانہ بھیج دیئے گئے یا پریس ضبط ہو گیا۔ سرکاری سائے یا سرپرستی سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ جب مرے تو سب غریب مرے' حسرت ہو' ظفر علی ہو' سید حبیب ہو' جالب ہو' مظہر الدین ہو' مہر ہو' سالک ہو' میکش ہو' بزمی ہو' اکرم ہو' شیخ عبدالمجید ہو' وفائی ہو' دین محمد علیگ ہو یا اپنی ذاتی جائیداد بیچ کر اسٹار آف انڈیا جاری کرانے والا خواجہ ناظم الدین ہو۔

10- بین الصوبائی لتاڑ پچھاڑ کا نام و نشان نہیں تھا۔ کسی کے تصور میں نہیں آ سکتا تھا کہ ایسے حالات بھی بن سکتے ہیں۔ جن کے تحت صوبائی عصبیتیں پرورش پا سکیں گی اور لالچ و رقابتوں کی وجہ سے مسلمانوں کا اندرونی شیرازہ بکھرنے لگے گا۔ مشرقی بنگال کے مسلمان ایک وقت اپنی رضا و خوشی سے بلکہ کسی حد تک زبردستی وفاق میں شامل ہوئے تھے۔ مگر بعد میں کیوں باغی ہو گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ تنگ نظری اور تعصبات اس زمانے میں نہیں تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں قوم کے بزرگ ہنوز زندہ تھے۔ جن میں وسعت قلب و نظر تھی۔

11- میں اپنی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان دنوں تحریک کا سارا زور اس پر صرف ہو رہا تھا کہ انگریز اور ہندو سے نجات حاصل ہو۔

تین باتوں پر کوئی سوچ تک نہیں رہا تھا۔

(1) آزادی کے بعد کس نوع کا آئین ہوگا؟

(2) ملک کی کیا حدود ہوں گی؟

(3) بٹوارے کے بعد بڑے پیمانے پر آبادیوں کو یہاں سے وہاں اور وہاں

سے یہاں منتقل کرنا پڑے گا۔

قصہ مختصر یہ تھے حالات جب 1940ء میں مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کر لی اور تحریک پاکستان کی ابتداء ہو گئی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا شروع میں انگریز اس تحریک کو کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دے رہا تھا' البتہ ہندوؤں نے خوب داویلا مچا رکھا تھا۔

بہر حال اس نوع سے معاملہ آگے بڑھتے گیا تا آنکہ بحمد اللہ سات سال کے اندر اندر پاکستان وجود میں آگیا۔

پاکستان بننے کے بعد حالات نے کیا رخ اختیار کیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

قیام پاکستان کے بعد پہلا سال

اگست 1947ء میں پاکستان وجود میں آگیا۔

چند مہینے پہلے تک کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس قدر جلد پاکستان بن جائے گا' حالانکہ لڑائی ختم ہوتے ہی محسوس ہونے لگا تھا کہ انگریز تھک چکا ہے۔ اس کا اپنی ہندوستانی افواج پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور امریکہ کی طرف سے اس پر شدید دباؤ ہے کہ وہ مشرق کے سب سے بڑے ملک ہندوستان سے نکل جائے تاکہ مشرق میں جاپان سے ایران تک ایک قسم کا خلاء پیدا ہو جائے جس کو وہ خود پر کرے یعنی اس علاقہ پر اس کی اپنی بالادستی قائم ہو جائے اور تجارت کے لیے یہ ساری نئی منڈیاں اس کو مل جائیں۔

یالٹا کانفرنس میں فاتح پاورز نے آئندہ کے لیے حلقہ ہائے اثر (SPHERES OF INFLUENCE) آپس میں تقسیم کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ اس موقع پر امریکہ کا صدر مصلحتاً خاموش رہا تھا اور اپنے لیے کچھ نہیں مانگا تھا مگر یہ اس کا محض تجاہل عارفانہ تھا۔ دل ہی دل میں اس نے یہ منصوبہ بنا لیا ہوا تھا کہ مشرق آزاد ہو جانے کے بعد یہ سارے علاقے اس کی اپنی تجارت اور اثر ورسوخ قائم کرنے کے لیے کھلے اور تیار مل جائیں گے۔ معاملہ صرف اتنا تھا کہ جن مغربی پاورز کا ان علاقوں پر اب تک تسلط تھا۔ ان کو وہاں سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر دیا چنانچہ اس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ جو ملک اب تک انگریز' فرنچ اور ڈچ ایمپائرز سے منسلک رہے تھے۔ ان کو فوراً آزاد کرا

دیا جائے۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آزادی حاصل کر لینے کے بعد یہ ملک غریب اور تنگ دست رہ جائیں گے اور وہ اس بات کے متلاشی ہوں گے کہ ان کو کوئی ایسا دولت مند اور ترقی یافتہ سرپرست مل جائے جو ان کی حاجت روائی کر سکے یعنی ان کو مالی ایڈ بھی عطا فرمائے اور ہمسایوں سے نمٹنے کے لیے کچھ مفت اسلحہ بھی سپلائی کرے۔ لڑائی کے بعد اب صرف امریکہ ہی ایک ایسا ملک رہ گیا تھا جو ان کی یہ ضروریات پوری کر کے ان جملہ کنگلوں کو اس کے عوض میں اپنے چھاتے کے تحت جمع کر کے اپنی تجارت اور عالمی سیاست کو فروغ دینے کے قابل تھا' چنانچہ اپنے اصلی منصوبہ کے عین مطابق امریکہ اس خدمت کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

امریکی سوچ کے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی برصغیر پاک و ہند سے انگریز کو نکالنا تھا' جس پر لڑائی ختم ہوتے ہی امریکہ نے اپنا پورا پورا زور لگا دیا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔ انگریز خود اس زمانے میں ٹوٹی پھوٹی حالت میں تھا اور امریکہ کا دست نگر بن چکا تھا۔ اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ وہ برصغیر پر اپنے قبضے کو طوالت دے سکے۔

مگر آگے چل کر امریکی منصوبے میں ایک رخنہ پڑ گیا۔ مشرق کا سب سے بڑا ملک ہندوستان اس کے دام میں نہیں آیا۔ امریکی اور ہندو دونوں ہم پیشہ بنیئے تھے۔ ایک دوسرے کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ ہندوؤں نے امریکہ کی نیت کو تاڑ لیا تھا۔ چنانچہ روزِ اول سے انہوں نے امریکہ سے دور رہنے کی پالیسی بنالی تھی۔ یعنی اپنی آزادی کو بامعنی بنانے اور مستقبل کے عالمی جھگڑوں میں امریکہ کا آلہ کار بننے کی خاطر' انہوں نے امریکہ کی محتاجی سے بچے رہنے کا تہیہ کر لیا۔ پرائم منسٹر نہرو کی پالیسیوں کی چند خصوصیات یہ تھیں۔ (1) غیر وابستہ "NON-ALIGNED" تحریک سے وابستگی اور سپر پاورز کی صف بندیوں سے دوری۔ (2) اندرون ملک انتہائی کفایت شعاری' (3) ملکی صنعت اور حرفت اور تجارت کو اس قدر فروغ کہ باہر سے کسی چیز کے منگانے کی ضرورت نہ رہے۔ (4) درآمدات قطعاً بند' (5) اسلحہ سازی اور بھاری انڈسٹریز کے لیے اپنے کارخانے لگانا' (6) اپنی افرادی قوت کو منتشر کرنے کے بجائے اس سے اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں کام لینا' (7) جلد سے جلد آئین بنا کر ملک کے مستقبل کی تصویر کو اس قدر صاف کر دینا کہ کسی غلط فہمی' توڑ پھوڑ یا غیر آئینی حرکت کی گنجائش نہیں رہے'

(8) ملکی عوام کو آزادی کے پھل کھلا کر ان کو آزادی کی قدر کرنے' اس پر فخر کرنے اور دل و جان سے ملک کے سپاہی بنے رہنے پر تیار کرنا' (9) جمہوریت کو ہر چیز پر اولیت بخشنا' (10) نوکر شاہی کو اس کے حقیقی مقام پر رکھنا' (11) دفاعی نظام پر سول کا کنٹرول' (12) کشمیر کا مسئلہ پیدا کر کے اندرون ملک مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف نفرت کے جذبات کو زندہ رکھنا۔

ہندو کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اندرونی طور پر اپنے مقام پر مستحکم رہ کر باقی ساری دنیا کو (امریکہ ہو یا روس) اپنے مقاصد کے لیے حسب ضرورت استعمال کرتا رہا۔ اور فائدے اٹھاتا رہا۔ (ان کے فلاسفر چانکیئے نے ان کو یہی سبق سکھایا ہوا تھا)

البتہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں باندھ کر تنہا امریکہ کی جھولی میں گرنے سے محترز رہا اور اس حد تک سارے مشرق کو ایکسپلائٹ کرنے کے بارے میں امریکی منصوبے میں رخنہ پڑ گیا۔ ادھر انڈوچائنا میں بھی اس کو مشکلات کا سامنا ہوا اور جلد ہی روس بھی تندرست و تنومند ہو کر مقابلے کے لیے میدان میں آ گیا۔

اب اپنا قصہ بھی سن لیجئے۔

جس طرح عرض کر چکا ہوں اگست 1947ء میں بحمد اللہ پاکستان بن گیا۔ فوری طور پر تو ہندوؤں نے تقسیم کا اصول مان لیا تھا مگر ان کے دل سے کدورت دور نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ یہ نیا ملک اس وقت کے حالات کے تحت اور جو رکاوٹیں وہ خود اس کے راستے میں ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کی وجہ سے چل نہیں سکے گا۔ اور سال چھ مہینے کے اندر خود بخود ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ پاکستان کے لیے جتنی مشکلات پیدا کی جا سکتی تھیں وہ لازماً پیدا کی جائیں۔ مثلاً (1) مشترکہ خزانہ سے جتنا حصہ پاکستان کو ملنا تھا' اس کی ادائیگی میں لیت و لعل ہوتا رہے (2) لاکھوں مسلمانوں کو مار مور کر اپنے یہاں سے نکال کر پاکستان بھیج دیا جائے۔ اس خیال سے کہ یہ نوزائیدہ ملک اتنی بڑی نئی آبادی کو یہاں بسانے میں ناکامیاب رہے گا۔ (3) مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں کا بھی بٹوارہ ہو' کلکتہ جس پر بنگال کی معیشت کا مدار تھا پاکستان کو نہ ملے' مشرقی پنجاب اس کے اپنے قبضہ میں رہے تاکہ اس راستے سے وہ کشمیر میں داخل ہو سکے۔ (4) جوناگڑھ اور سرحد پر واقع چند ریاستوں کو

پاکستان سے الحاق کرنے سے جبراً روک دیا جائے۔

یہاں پاکستان کے وجود میں آتے ہی دارالحکومت کراچی بنا۔ ایک تو قائد کا کراچی سے اپنا پیدائشی لگاؤ تھا اور دوسرے نمبر پر اس وقت کی سندھی سیاسی قیادت نے پہلے سے دہلی پہنچ کر باصرار اس خواہش کا اظہار کیا ہوا تھا کہ وفاقی کیپٹل ان کے یہاں رہے۔

چنانچہ سندھی لیڈروں کی درخواست منظور فرما کر قائداعظمؒ اپنے کچھ رفیقوں کے ساتھ 14 اگست سے پہلے ہی چند روز تشریف لے آئے۔ مقامی عوام نے اس پیمانے پر ان کا استقبال کیا کہ اس کی مثال کراچی کی تاریخ میں نہیں ملتی تھی۔

ایک وہ دن تھا جب آخر 1930ء میں ہماری انتہائی کوششوں کے باوجود کراچی سے قائد کو رخصت کرنے کے لیے صرف ہم چار آدمی کیماڑی بندرگاہ پہنچے تھے۔

(کھوڑو مرحوم' گزدر مرحوم' جناب جی ایم سیّد اور یہ فقیر۔)

اور پھر یہ دن تھا جب ان کے استقبال کے لیے اسی کراچی کی نصف آبادی گھروں سے باہر نکل آئی تھی۔

میں نے یہ فرق دیکھا اور محسوس کیا کہ پاور بڑی چیز ہے۔ اس کی طرف ہر متنفس خود بخود کھنچا آتا ہے اور جب پاور نہیں تو اپنے پرائے سب آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا لالچی انسان کی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاور حاصل کرنے کے لیے کٹ مرتا ہے۔

بہرحال پاکستان بننے اور قائداعظم کے سربراہ بننے کے بعد' ہر آنکھ' ان کی طرف اٹھنے لگی۔ ان کی شخصیت میں وہ اثر تھا کہ جو عام فہم الفاظ میں صرف جادو سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان کو دیکھ کر لوگوں نے مستقبل سے متعلق کسی بات پر خود سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ عام موقف یہ رہا کہ ہر مرض کا علاج اور ہر مسئلہ کا حل قائد کے پاس ہوگا...... یعنی جس شخص نے پاکستان کو جنم دیا ہے وہی اس کی پرورش کے طریقے جانتا ہوگا اور کوئی فکر مند کیوں ہو؟ کسی نے خود نہیں سوچا کہ آئین کیا ہوگا' نظام حکومت کیا ہوگا۔ صوبوں اور وفاق میں اختیارات کی تقسیم کن خطوط پر ہوگی۔ ہر ایک کی نظروں کے سامنے قائد کی تصویر اور کیریکٹر رہے اور یہ فرض کرلیا گیا کہ جس

سانچے میں قائد خود ڈھلے تھے لازماً اسی سانچے میں ان کے رفیق اور کارکن اور چنے ہوئے اہلکار بھی ڈھلے ہوئے ہوں گے اور جن اصولوں پر انہوں نے اپنی زندگی بسر کی تھی یا جن اقدار کے قیام کی خاطر انہوں نے اپنی متاع حیات صرف کر ڈالی تھی' ان کو بلا تکلف اپنایا جائے گا اور کسی اختراع' اجتہاد' ریشہ دوانی یا الفاظ کے معنی اور مفہوم پر اختلاف اور رسہ کشی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی یقین تھا کہ اس کے انسانی' شہری اور جمہوری حقوق محفوظ رہیں گے کیونکہ قائد خود ساری عمر انہیں اقدار کے تحفظ کے لیے لڑتے رہے تھے۔

قائد کی جدوجہد کا یہ پہلو خاص طور سے عام شہری کے لیے باعث اطمینان بنا ہوا تھا کہ انہوں نے بڑے لوگوں کو پس منظر میں دھکیل کر اپنی سیاست اور مساعی کا سارا مدار غریب اور ان پڑھ عوام پر رکھا ہوا تھا اور انہی کی مدد اور ووٹ سے پاکستان حاصل کیا تھا۔ یہ بات کسی کے تصور میں نہیں آسکتی تھی کہ اولاً قائداعظمؒ خود اس قدر جلد ان سے رخصت ہو جائیں گے اور ثانیاً ان کے رخصت ہو جانے کے بعد سب کام الٹا ہونے لگے گا۔

یعنی جس جمہور کی سلطانی قائم کرنے کے لیے ملک بنایا گیا تھا اس جمہور کو تو پس منظر میں دھکیل دیا جائے گا اور سلطانی چند موقع پرستوں' سازشیوں اور محلاتیوں چمچوں اور پاور کے بھوکوں کے حوالے ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ وہ ایسا حال کر دیں گے کہ ملک ایک ڈری ہوئی کانپتی ہوئی مجبور ہرنی کی طرح بیچ میں ہوگا اور اس کے چاروں طرف شکاریوں کا گھیرا ہوگا اور ہر شکاری کی زبان پر یہ کلمہ "کہ اے ہرنی! تم چپ کر کے فی الحال لمبی پڑی رہو ورنہ یہ شکاری تم کو پکڑ لے گا۔ وہ شکاری تم کو کھا جائے گا۔ وقت آنے پر یہ نیک نیت بندہ خود تم کو اس بے یقینی کی کیفیت سے چھڑانے کی خاطر تم کو کھانے کے لیے حاضر ہو جائے گا اور اس نزاکت' نفاست اور محبت سے کھا جائے گا کہ تم کو تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔"

اس بدبختی کا اس غریب قوم کے پاس کوئی علاج نہیں تھا کہ قائداعظمؒ ابھی پورے طور سے بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ ان کی صحت تیزی سے بگڑنے لگی۔ ہندوستان میں تو نہرو اٹھارہ سال چلتا رہا مگر یہاں ہمارا قائد اٹھارہ مہینے بھی ہمارے ساتھ

نہیں رہ سکا۔ وہ مشکل سے تیرہ مہینے زندہ رہے اور آخری چھ مہینے تو بستر علالت پر۔

جب تک علالت نے ان کو معذور نہیں کر دیا تھا وہ بعض فوری توجہ کے مقتضی بڑے مسائل میں الجھے رہے مثلاً:

(1) ایک نئی ریاست کی بنیادی ضروریات کی کفالت۔
(2) مہاجروں کی آبادی۔
(3) کشمیر۔
(4) سرحدوں کا تعین (ریڈ کلف کمیشن وغیرہ)۔
(5) زخم خوردہ ماؤنٹ بیٹن کی ریشہ دوانیاں۔
(6) جوناگڑھ، حیدر آباد اور دوسری اسلامی ریاستوں کے تحفظ کی فکر۔
(7) داخلی نظم و نسق، لا اینڈ آرڈر۔
(8) فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام۔
(9) پیسے کی عدم موجودگی۔
(10) اندرون ملک کانگریس کے چھوڑے ہوئے اثرات کا ازالہ۔

ایک ستر سالہ بزرگ پر ان مسائل کے بوجھ کا جو اثر ہونا تھا وہ ہوا اور وہ اس ملک کے عوام کو بیچ منجدھار چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد اب صرف امیدیں رہ گئیں کہ ان کی چھوڑی ہوئی روایات کو ملحوظ رکھا جائے گا اور مستقبل کی تعمیر انہی خطوط پر ہوتی رہے گی جن خطوط پر انہوں نے خود اپنی زندگی بسر کی تھی...... یعنی پاکیزگی عمل، کیریکٹر، بلکہ خیالات اور اصولوں کے لحاظ سے ہر پاکستانی لیڈر اور سیاسی کارکن جناح بن کر رہے گا۔

گاڑی نے ڈگمگانا شروع کیا

میں اس قصہ کو آگے بڑھاؤں اس سے پہلے تھوڑا سا اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ میری تحریر کی بنیاد سنی سنائی یا دور سے دیکھی ہوئی باتوں پر ہے۔

پاکستان بننے سے چند سال پہلے میں نے انگریزی ہفتہ وار پرچہ "مسلم وائس" جاری کیا تھا، جس کے ذریعے میں تحریک کی خدمت کرتا رہا۔

پاکستان بنتے ہی ہندو یہاں سے بھاگ نکلے۔ سندھ آبزرور ان کا وقیع ترین انگریزی روزنامہ تھا جس کو انہوں نے اب خان بہادر کھوڑو مرحوم کے ہاتھوں بیچ دیا۔ کھوڑو صاحب نے یہ روزنامہ خریدتے ہی میرے حوالے کر دیا۔ پالیسی کے معاملہ میں میں آزاد تھا۔ اس زمانے میں یہ عام روایت تھی کہ اخبار کی تحریروں پر مالکوں کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا تھا۔ مالکوں کا معاش کا ذریعہ اخبار نہیں ہوتے تھے، لہٰذا ان کو ایڈیٹروں کو آزاد چھوڑنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ویسے اگر وہ ایڈیٹروں کو تحریر کی آزادی نہ دیتے تو غالباً کوئی باضمیر ایڈیٹر ان کو اخبار چلانے کے لیے ملتا بھی نہیں اور اس زمانے کے صحافی "بے ضمیر رابٹ" ہوتے ہی نہیں تھے۔ میں نے خود بارہا اخبار کے مالک کھوڑو صاحب مرحوم کی بعض پالیسیوں کے خلاف لکھا مگر اس وجہ سے وہ مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوئے بلکہ وہ تو خوش ہوتے تھے کہ ان کی اخبار کی تحریریں آزادانہ ہوتی ہیں۔ وہ چاہتے تو مجھے اخبار سے نکال سکتے تھے مگر ان کے تصور میں بھی

کبھی ایسی بات نہیں آئی۔

صحافت کا وہ دور ہی اور تھا۔ مالک اخبار کو مالدار بننے کا ذریعہ نہیں بناتے تھے۔ اخبارات کے سامنے مجموعی ملکی مفاد رہتا تھا اور اس مقصد کے حصول کی خاطر کسی سے ٹکر لینے اور قربانیاں دینے سے نہیں گھبراتے تھے۔ یہی سندھ آبزرور جس وقت میں نے چارج لیا' سرکاری حکم سے چھ مہینے کے لیے بند تھا' یہ بندش خوش قسمتی سے میرے آتے ہی ختم کر دی گئی تھی۔

ایک فرسٹ کلاس انگریزی روزنامے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے میرے پاس صحیح معلومات حاصل کرنے کے کئی ذرائع موجود تھے جن کو میں خوب استعمال کرتا رہتا تھا۔ کوئی ایسی چیز نہیں ہو رہی تھی جو پیشگی میرے علم میں نہ آ سکی ہو۔

میری ایڈیٹری خود مالی منفعت کے لیے نہیں تھی۔ محض شوقیہ میں نے اس صحرا میں قدم رکھا تھا اور اس لحاظ سے میں دوسروں کے مقابلے میں قدرے زیادہ مستعد رہتا تھا۔ پھر میرا اٹھنا بیٹھنا بھی ہر جگہ رہتا تھا۔ ایک خاص پس منظر کی وجہ سے مجھے کچھ وقعت دی جاتی تھی جس کا فائدہ میں اپنی معلومات میں اضافہ کے لیے اٹھاتا تھا۔

حاصل مقصد یہ ہے کہ اس دور کی کوئی چیز میری نظروں سے اوجھل نہیں رہتی تھی نہ ایسی کوئی چیز ہوتی تھی جس کے محرکات مجھے معلوم نہ ہو سکے ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کے قیام کی وجہ سے بے شمار نئے لوگ یہاں وارد ہو گئے تھے (اور ان میں سے بہت سارے تو یہاں آتے ہی کلیدی آسامیوں پر لگ گئے تھے) جن کا پچھلا حال یا جن کے اب کے عزائم بہتوں کو معلوم نہیں تھے مگر میرا معاملہ اور تھا۔ میں ان میں سے بہتوں کو تو پہلے سے جانتا تھا اور نوکر شاہی کے لوگ جو اب دہلی سے چل کر یہاں پہنچے ہوئے تھے اور جن کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ ان کے تیور بھی (یہاں آنے کے بعد) تاڑنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ **یعرف المجرمون بسیماھم**۔ انسان پیٹ خالی اور آنکھیں کھلی رکھے۔ تو بہت کچھ دیکھ سکتا ہے جو بھرے پیٹ سے نظر نہیں آ سکتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد جلد ہی میں الطاف حسین مرحوم ایڈیٹر ڈان کی جگہ آل پاکستان ایڈیٹرز کی جماعت کا صدر بھی منتخب ہو گیا تھا اور اس سے دو مہینے بعد پاکستان اور

ہندوستان کی مشترکہ ایڈیٹرز کمیٹی کا مشترک صدر۔

انہی دنوں پاکستان سرکار کے حکم سے میں پاکستانی ایڈیٹروں کا ایک وفد لے کر (نہرو لیاقت پیکٹ کے سلسلے میں) دہلی پہنچا تھا اور وہاں سے ان علاقوں کا دورہ کرنے کے بھی مواقع میسر آئے تھے جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے۔ اس زمانہ تک بھارت کے اخبار بھی یہاں آتے رہتے تھے جن سے ہم کو معلوم ہوتا رہتا تھا کہ بھارت کن خطوط پر چلنے لگا ہے اور اس کے مقابلہ میں یہاں کیا ہو رہا ہے۔

ان سارے ذرائع معلومات اور ذاتی مشاہدات کی بدولت میں آسانی سے دونوں نو آزاد ملکوں میں پیدا ہونے والے حالات اور واقعات کا تقابلی مقابلہ کر سکتا تھا۔

اس سے پہلے تحریک کے دوران میں میں صوبائی مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی خارجہ کمیٹی کا سیکرٹری اور آل انڈیا کونسل کا ممبر رہ چکا تھا۔ مارچ والے لاہور اجلاس کے سلسلے میں مجھے تقریباً ایک سال لاہور میں رہ کر کام کرنا پڑا تھا۔ اسی اثناء میں سکھر منزل گاہ تحریک چلی تھی اور ایک زبردست ٹریبونل بیٹھا تھا۔ اس ٹریبونل کے سامنے بھی مسلم لیگ کی طرف میں نے تنہا وکالت کی تھی اور کیس جیتے تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد میں کئی مناصب پر فائز رہا۔ مثلاً سندھ اسمبلی کا ممبر' پاکستان پارلیمان کا ممبر' آئین ساز اسمبلی کا ممبر' صوبائی وزیر' مرکزی وزیر' سفیر' مشیر اور کئی اہم محکموں کا انتظامی سربراہ (بحمد اللہ سارے پاکستان میں میں ہی ایک وزیر تھا جو صوبے میں بھی رہا اور مرکز میں بھی' مگر انتہائی مقابلوں اور مخاصمتوں کے باوجود میرے خلاف نہ پروڈا لگ سکا۔ نہ ایوبی ایبڈو اور یہ اعزاز صرف مجھے ہی حاصل رہا)

یہ ساری تفصیل اس قدر وضاحت سے میں محض اس غرض سے یہاں عرض کر رہا ہوں کہ ناظرین کرام کو اطمینان ہو جائے کہ جو کچھ میں اس وقت لکھ رہا ہوں اس کی بنیاد محض دور سے یا باہر سے سنی سنائی باتوں پر نہیں۔

اب آمدم برسر مطلب۔ قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ یہاں کے حالات فوکس میں آنے لگے تھے اور چند نئے اور اہم رجحان محسوس ہوئے مثلاً:

(1) قائداعظم کا انتقال ہوتے ہی عوام غریب پر تو سکتہ کی سی کیفیت طاری

ہو گئی۔ فضا بھاری اور حالات غیر یقینی ہونے لگے' البتہ یہ ضرور محسوس ہونے لگا کہ عوام سے اوپر کی لیول کی سطح پر مختلف عناصر یا مفادات نے اپنی اپنی قسمت کو سنوارنے کے لیے دوڑ بھاگ شروع کر رکھی ہے۔ اگر یہ مطلب عام فہم الفاظ میں ادا کیا جائے تو یوں ہو گا کہ گویا قائداعظم کی چھوڑی ہوئی میراث کو اپنی طرف سمیٹنے کی غرض سے مختلف کیمپ کھل گئے تھے اور اب گروپوں کی بنیاد پر بات چلنے لگی تھی۔ کچھ گروپ تو نظر آ رہے تھے اور کچھ کے عمل سے یہ گمان پیدا ہوتا تھا کہ وہ چھپ چھپ کر اندر ہی اندر اپنے کام لگے ہوئے ہیں۔

ایک گروپ

نوکر شاہی کے سیاسی عزائم رکھنے والے لوگوں کا تھا۔

دوسرا گروپ

بنگالی لیڈروں کا تھا جن کے روحِ رواں مرحوم فضل الرحمٰن صاحب' مرحوم خواجہ شہاب الدین صاحب اور مرحوم الطاف حسین صاحب تھے۔

تیسرا گروپ

نو وارد بھائیوں پر مشتمل سمجھا جاتا تھا (پہلے وہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے تھے' مگر پاکستان بنتے ہی یکایک مسلم لیگ کے پس منظر میں چلے جانے سے یہ فطری اور جائز بات تھی کہ ان کے دلوں میں اس نئے ملک کے اندر اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کا احساس اجاگر ہو)

چوتھا گروپ

مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کے مقامی لیڈروں کا تھا جو ایک مدت تک پاور میں رہے تھے اور جن کی کوشش اب یہ تھی کہ نئے حالات کے تحت بھی ان کو چھیڑا نہ جائے اور ان سے پاور نہ چھینی جائے۔

(ایک بات میں اس سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ ان میں سے کسی گروپ کی یہ نیت ہرگز نہیں تھی کہ پاکستان کو نقصان پہنچے کیونکہ پاکستان قائم رہنے سے ہی ان کے اپنے مقاصد اور عزائم کی تکمیل کا سامان ہو سکتا تھا' البتہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ یہ سمجھ رہا تھا کہ پاکستان صرف اس صورت میں ہی بچ سکتا ہے۔ اگر زمام اختیار اس کے اپنے ہاتھوں میں رہے ...... بالفاظ دیگر نظر بظاہر نیت تو ہر ایک کی نیک تھی۔ صرف یہ خیال نہیں کیا جا رہا تھا کہ اصولاً گروپ بندی یا گروپوں کی بنیاد پر باہمی آویزش ان کی موہوم خدمت کو ملک کے لیے زحمت میں تبدیل کر دے گی۔)

گروپ بندی کے اس ماحول میں یہ سوچنے کی گنجائش پیدا ہو جاتی تھی کہ غالباً ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ جب تک یہ بات یقینی نہ ہو جائے کہ آئندہ کے تصادم میں اس کا اپنا پلہ بھاری رہے گا۔ تب تک غیر یقینی اور مبہم کیفیت کو قائم رہنے دیا جائے تاکہ مدمقابل قبل از وقت دوسروں پر سبقت حاصل کر کے پہلے سے میدان نہ مار لے چنانچہ ہر ایک کی خواہش اور کوشش یہ رہی کہ وہ جلد سے جلد اپنے پاؤں جما کر پاور پر خود قبضہ کرنے کے قابل بن جائے۔

اس انداز فکر کے نتیجہ کے طور پر جو چیزیں رفتہ رفتہ کھل کر سامنے آئیں وہ یہ تھیں۔

(الف) ملکی نظام ترجیحات میں جس بات کو اولیت حاصل ہونی چاہیے تھی وہ یہ تھی کہ جلد سے جلد مستقل آئین بنا دیا جائے۔ ہندوستان نے شروع کے ہی دو سال کے اندر اپنا مستقل آئین بنا کر مستقبل کی تصویر کو صاف کر دیا تھا اور ہر عوامی حق اور جمہوری اصول کے تحفظ کے لیے اس کے چاروں طرف آئینی اور قانونی حصاریں کھینچ دیئے گئے تھے۔ برعکس اس کے ہمارے یہاں نو سال تک آئین نہیں بن سکا۔ اس اثناء میں سازشی عناصر کے لیے توڑ پھوڑ کا دروازہ کھلا رہا۔ کئی رقابتیں اور بدگمانیاں ابھر آئیں' صوبوں کو ایک دوسرے کی نیت پر شبہ ہونے لگا۔ وفاق اور صوبوں کے تعلق میں سقم بڑھتا گیا (مثلاً مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلہ پر جھگڑا شروع ہو گیا اور خونریزی تک نوبت پہنچی۔)

(ب) آئین سازی میں اس قدر تاخیر کی مختلف توضیحات ہوتی رہیں مثلاً شکی مزاج لوگوں نے تاخیر کو اس بات سے منسوب کیا کہ یہ گروپ نہیں چاہتے کہ جس تصور کی بنیاد پر پاکستان بنا تھا اور عوام سے ووٹ لیے گئے تھے' اس تصور کو آئینی تحفظ مل جائے بلکہ یہ تاخیر ہے ہی اس لیے کہ وہ تصور رفتہ رفتہ اس قدر مدھم پڑ جائے گا کہ آگے چل کر ان کے گروہی سیاسی عزائم میں یہ کسی رکاوٹ کا باعث نہ بن سکے۔ یعنی عوام کی پوزیشن بے زبان حیوانوں جیسی رہ جائے۔

یاد رہے کہ یہ تصور جس کی بنیاد پر پاکستان بنا تھا اور جس کی خاطر غریب عوام نے نہ صرف ووٹ دیئے تھے بلکہ اپنی جانیں تک گنوادی تھیں' وہ تصور تھا ''سلطانی جمہور'' کا یعنی پاور کا۔ سرچشمہ عوام خود ہوں گے۔ ان کو مکمل جمہوری آزادیاں میسر ہوں گی۔ اپنے ووٹ سے وہ جس کو چاہیں گے اتار پھینکیں گے اور نظام حکومت جو بھی ان کو مرغوب ہو گا وہ اپنے ووٹ سے نافذ کریں گے (چونکہ وہ سب مسلمان تھے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ غیر اسلامی نظام رائج کریں گے) ان کو (یعنی عوام کو) وہ سب حقوق آئینی طور پر حاصل ہوں گے۔ جن کے بغیر کوئی انسانی گروہ اپنے کو آزاد اور باآبرو نہیں کہلوا سکتا۔

یہ شکی طبیعتیں یہاں تک کہتی سنی گئیں کہ اصل میں درون خانہ جھگڑا ہی اس بات پر ہے کہ ''سلطانی جمہور'' والے اصول کو ملیامیٹ کیا جائے۔ پاور عوام کے ہاتھ میں نہ جانے پائے اور عوامی ووٹ کی کوئی ضرورت نہیں رہے تاکہ یار لوگ اوپر ہی اوپر جوڑ توڑ کر کے محلاتی سازشوں کے ذریعے خدائی فوجدار بن کر عوام کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں۔ نہ ان کو ووٹ کے لیے عوام کے دروازے پر جانا پڑے نہ عوام اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے منتخب نمائندوں سے حساب کتاب لے سکیں...... یعنی عوام کا مصرف صرف اس قدر رہ جائے کہ ان کو احمق بنا کر حسب ضرورت ان سے نعرے لگوائے جائیں' جلوس نکلوائے جائیں اور اپنے حریفوں کی ان

کے ہاتھوں توہین کرادی جائے۔

یہ لوگ باصرار و بتکرار (اس زمانے میں) کہتے رہتے تھے کہ درون خانہ سارا جھگڑا ہی اس بات پر چل رہا ہے کہ اختیار کا سرچشمہ ملکی عوام ہوں یا اوپر کے چند طالع آزما اور مہم جو افراد جو کسی طرح سے ایک مرتبہ کرسی تک پہنچ جاتے ہیں اور اسی مقصد کی خاطر آئین سازی اور عوام کے جمہوری حقوق کی صراحت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا رہنے دیا جارہا ہے ورنہ کوئی سبب نہیں ہے کہ کوئی ملک نو سال تک بغیر آئین رہے۔

(ج) مدتیں گزر گئیں مگر نئے انتخابات نہیں ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ مقصد یہ ہو کہ عوام کو موقع نہ دیا جائے کہ وہ مناسب وقت سے پہلے ہی کوئی الٹا فیصلہ کر ڈالیں...... لہٰذا چونکہ آئین نہیں تھا۔ انتخابات بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

(د) جماعتی تنظیم جو اس وقت مسلم لیگ کے نام سے چلتی تھی۔ نیست و نابود ہو گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ بھی عوام کی طرف سے اوپر والوں پر دباؤ ڈال کر آئین وغیرہ پاس کرانے کا ذریعہ بن سکتی تھی' لہٰذا اس کو ختم کر دینا بڑے پلان کے عین مطابق سمجھا گیا۔

(ہ) یہ تاخیری حربے اور یہ غیر یقینی حالات' موجودہ اور آئندہ ہونے والے رقیبوں اور مخالفوں کو خراب و خوار کر کے سیاسی میدان سے پہلے سے نکال دینے کے لیے استعمال ہوتے دیکھے گئے۔ یہ بھی محسوس ہوتا رہا کہ جن لوگوں کو آئینی طریقوں سے نکالنے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں' ان کو جھوٹے مقدموں میں پھنسا کر جیل بھیج دینا یا خاص ''قانون'' وضع کر کے سرے سے ہی سیاست کے لیے نااہل قرار دے دینا مناسب سمجھا جانے لگا۔ اس کارگزاری کا مقصد یہ معلوم ہونے لگا کہ یار لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سیاست کے پیشے کو اس قدر ذلیل کر دیا جائے کہ سیاست خود ایک گالی بن جائے اور بے آبروئی کے خوف سے کوئی اچھا باضمیر اور خوددار آدمی سیاست کے میدان میں قدم نہ رکھے یعنی پہلے کے آدمیوں کو تو رسوا اور خراب کر کے بھگا دیا جائے اور نئے آدمیوں کا سیاست میں آنا دشوار بنا دیا

جائے تاکہ جمہوریت کا پودا سوکھ سڑ جائے اور نوکر شاہی کی ڈکٹیٹری کے لیے میدان کھل جائے (نوکر شاہی نے اولاً بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی ڈکٹیٹری چلائی اور بعد میں اپنی گرفت کو مزید پختہ کرنے کے لیے ایوب خان والوں کو میدان میں لے آئی اور ان سے پاور میں حصہ دار بن کر ملکہ عالم بن کر بیٹھ گئی) ایک وقت ایسا بھی آیا کہ راولپنڈی سازش کیس والا جنرل اکبر خان میدان میں کود پڑا اور اس سے یہ مؤقف منسوب ہوا کہ "اگر سول نوکر شاہی پاور کے مزے لے رہی ہے تو ہم کیوں ان مزوں سے محروم رہیں؟ ان کے پاس قلم ہے تو ہمارے ہاتھوں میں تو اس سے زیادہ مہلک چیز ہے!"

(ر) عوام غریب کو بے حال' بزدل اور گمراہ کرنے کی غرض سے ان کے ذہنوں میں نفرت اور خوف کا بیج بویا گیا تاکہ ان کا دھیان اصلی راہ سے بھٹک کر کسی دوسری طرف لگ جائے اور وہ اپنے جمہوری حقوق مانگنے کے قابل نہ رہیں۔ نفرت پہلے ہندو سے تھی اور اب جو وہ چلا گیا تو اس نفرت کا رخ اپنوں کی طرف موڑنے کی کوشش ہوئی۔ جہاں تک خوف کا تعلق تھا تو وہ پہلے انگریز سے تھا اب نوکر شاہی کے نئے حکمرانوں کے سامنے لوگوں کو سجدہ ریز کرنے کے لیے ان کی طرف سے عوام کے دلوں میں پیدا کیا گیا۔ طرح طرح کے نئے قانون پاس ہوئے اور استعمال ہوتے رہے۔ ڈی پی آر' سیفٹی ایکٹ' فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن وغیرہ وغیرہ' بغیر مقدمہ چلائے مخالفوں کو نظر بند کر دینا یا جیل میں بٹھا دینا ایک معمول بن گیا۔

(ز) انتظامیہ پر خرچ میں بے تحاشا اضافہ ہوتا رہا۔ نئے نئے عہدے پیدا کیے گئے' نئے نئے کھاتے کھولے گئے' نوکر شاہی کا جال وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ نوکر شاہی والوں کے آشناؤں اور رشتہ داروں کو خوب سے خوب تر آسامیاں ملتی گئیں۔

(ح) ویسے تو پیسے کی قلت تھی مگر اس شاہ خرچی کے نئے سلسلہ کے لیے پیسہ فراہم کرنے کی غرض سے پبلک پر طرح طرح کے نئے ٹیکس لگائے گئے تاکہ اس بوجھ کے تلے عوام کی کمر سیدھی نہ ہو سکے۔

(ط) محکمہ خارجہ کی تنظیم غلط بنیادوں پر ہونے لگی جس کے نتائج آج تک بھگتے جا رہے ہیں۔

(ی) افسر شاہی کے آدمیوں کے لیے کالونیاں اور بنگلے بننے لگے اور یہاں سے رشوت ستانی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ اس بھوک کو بجھانے کے لیے پرمٹوں' لائسنسوں' کارپوریشنوں' کمیشنوں (اور آگے چل کر (STATE TRADING) کا گورکھ دھندا مروج ہوا۔

(ک) ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی تقسیم پر ایسے گھپلے ہونے لگے کہ ان کی وجہ سے ایک طرف تو مجموعی قومی کیریکٹر پر کاری ضرب پڑی اور دوسری طرف قوم کے اندر ہی مختلف عناصر کے مابین رقابت اور دشمنی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

(ل) آئینی خلاء کی وجہ سے اٹانومی (علاقائی خود مختاری) کے سوال پر صوبوں اور مرکز کے تعلقات بگڑنے لگے اور صوبائی تعصبات بڑھ گئے۔

(م) حال ہی میں ایک اور تکلیف دہ بات کا انکشاف ہوا ہے جو اسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خان نے ایک انٹرویو کے ذریعہ اس تلخ حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان سے مادرِ ملت مرحومہ کو حسد (JEALOUS) تھا' جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس زمانے میں اندر ہی اندر دو چوٹی کے گھروں میں بھی چل گئی تھی۔ کاش! محترمہ بیگم صاحبہ اس بات کو اتنے عرصہ کے بعد نہ چھیڑتیں کیونکہ اس سے کئی اور نئے نازک سوالات کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔

چونکہ ان باتوں کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اگلے ہفتے تک مہلت چاہتا ہوں۔ سر دست پڑھنے والے حضرات صرف یہ چند نکات اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ یعنی یہ کہ......!

(1) قائداعظمؒ کے انتقال کے ساتھ ہی زیر زمین اور پس پردہ گروپ بندی شروع ہو گئی تھی۔

(2) نو سال آئین نہیں بنا۔

(3) نئے انتخابات نہیں ہوئے اور عوام کو سیاست میں نئے خون کو سامنے لانے کا موقع نہیں ملا۔

(4) عوامی تنظیم کو کمزور اور بے اثر بنا دیا گیا۔

(5) اور (سب سے اہم اور کلیدی نکتہ) اندر خانہ اصل جھگڑا اس بات پر چل پڑا کہ سلطانی جمہور کی نہ ہو، حکومت کو ووٹ کے ذریعے منتخب کرنے اور اس طرح سے انتظامیہ پر کنٹرول کا اختیار عوام کے ہاتھوں میں نہ جانے پائے تاکہ عوام کو ان کے شہری حقوق کے اصول اور آزادانہ اور باآبرو زندگی بسر کرنے اور سیاسی طور پر طاقتور بننے کے مواقع سے محروم رکھا جا سکے۔ وہ محض پیدائشی احمقوں اور مجبوروں کی طرح صاحب اقتدار لوگوں کے اشاروں پر چلتے رہیں۔ جب ان سے کہا جائے کہ ہنسو تو وہ ہنسنے لگیں اور جب رونے کو کہا جائے تو فوراً آنسو بہانے کے لیے تیار ہو جائیں۔

(6) میری نظر میں ہماری سیاسی گاڑی وہیں سے پٹڑی سے اترنے لگی۔

نو سال آئین نہیں بنا...... کیوں؟

پچھلے مضمون میں پیش کردہ نکات کی وضاحت عرض ہے۔

پہلا نکتہ یہ تھا کہ نو سال تک آئین نہیں بنا۔ اس اثناء میں حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں مگر اس کام میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی حالانکہ یہی اصلی بنیادی اور پہلے کرنے کا کام تھا۔

بھارت نے دو تین سال کے اندر اپنا نیا آئین منظور کر کے اگلے سال ملک بھر میں نئے انتخابات بھی کروا لیے مگر ہمارے یہاں آئین سازی اور انتخابات دونوں نو سال کھٹائی میں پڑے رہے (فی الحقیقت انتخابات تو پھر بھی 1970ء تک نہیں ہوئے۔)

غور طلب بات یہ ہے کہ ہماری آئین ساز اسمبلی نے شروع میں ہی قرارداد مقاصد منظور کر لی تھی جس پر کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اب اس طرح آئین کے بنیادی مقاصد متعین ہو جانے کے بعد صرف رسمی طور پر خانہ پُری رہ گئی تھی' جو بلا سبب نو سال تعویق میں ڈال دی گئی۔

یہ کیوں ہوا؟

کیا وجہ یہ تھی کہ بعض طاقتور عناصر یہ چاہتے تھے کہ نئے انتخابات ہونے نہ پائیں۔

جمہوریت کو جڑ پکڑنے کا موقع نہ ملے۔

عوام کے جمہوری حقوق متعین نہ ہو سکیں۔

عوام اس پوزیشن میں نہ آئیں کہ وہ اپنے ووٹ سے حکومت سازی کر سکیں۔

سیاست اور انتظامیہ دونوں عوام کے کنٹرول سے باہر رہیں تاکہ اس اثناء میں سیاسی عزائم رکھنے والے' طالع آزما عناصر کو ٹائم ملے کہ وہ اکھاڑ پچھاڑ کر کے اپنے لیے سیاسی میدان ہموار کرلیں۔

ظاہر تھا کہ ہر نئی سیاست کے لیے بنیادی پتھر آئین ہوتا ہے اور جب تک آئین نہ ہو' ریاست کا وجود غیر مستقل' بیچ میں معلق رہتا ہے اور کوئی دشمن بھی آکر ایسی غیر پختہ ریاست پر قبضہ کر سکتا ہے۔

قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ اس آئینی خلاء کے زمانے میں ایک مرتبہ بھارت کی فوجیں پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے سرحدوں پر بھی آگئی تھیں اور اس بلا کو ٹالنے کے لیے مرحوم ومغفور لیاقت علی خان کو بذاتِ خود پنڈت نہرو کی خدمت میں دہلی حاضر ہو کر نہرو لیاقت پیکٹ کرنا پڑا تھا گو کہ یہ مصیبت اس وقت تو ٹل گئی تھی مگر اس کے بعد بھی اس خطرے کی تلوار سارا عرصہ ہماری گردنوں پر لٹکتی رہی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان کو پورے نو سال بے آئینی ایسی "بے بنیاد" مبہم اور خطرناک حالت میں کیوں رہنے دیا گیا؟

نہ صرف یہ بلکہ اس آئینی خلا کے دور میں ایک اور گُل بھی کھلایا گیا۔

یعنی بعض سیاستدانوں کو آمادہ کردیا گیا کہ وہ اس سے پہلے کہ ملک کو آئینی راستہ پر ڈال کر آگے لے چلیں ایک دوسرے کی جڑ اکھاڑنے میں لگ جائیں۔

اس حرکت کی تہہ میں یقیناً یہ خیال کارفرما تھا کہ سیاستدانوں کی اس آپس کی کشمکش کا مجموعی اثر یہ ہو گا کہ ملکی فضا مسموم' سیاست پراگندہ اور قومی تنظیم تتر بتر ہو جائے گی۔ اور آئینی خلاء اس طریقے سے اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ وہ اپنے عزائم کی تکمیل نہیں کرلیں گے۔

آیئے ہم اس نکتہ پر کسی قدر تفصیل سے بات کریں۔

ہر قوم کے لیے لازم ہوتا ہے کہ جب اس کو آزادی ملے تو اس آزادی کو

مستحکم اور باثمر بنانے کے لیے اپنے اندر اتحاد پیدا کرلے اور اپنے جملہ اجزاء ترکیبی کو جمع کر کے اپنی ساری اجتماعی قوتیں اپنی آزادی کو صحیح اور پختہ خطوط پر ڈالنے کے لیے بروئے کار لائے۔ یہ ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ آزادی ملتے ہی عوام کو قطعاً گلدستہ طاقِ نسیاں بنا کر' صرف اوپر کے عناصر' اپنی نئی پرانی باہمی کدورتوں کی بنا پر یا اپنی ذاتی اور گروہی سیاسی اغراض کے لیے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو کر قوم کی اس مجموعی قوت کو نقصان پہنچائیں جو قوت بغیر اتحاد و یگانگت کسی مقصد کو حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔

اسرائیل اور ہندوستان کی مثالیں لیجئے۔ اسرائیل کو ہم سے دو سال بعد ملک ملا اور اس کی ریاست قائم ہوئی۔ ہندوستان تو ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا۔ شروع میں ان کو بھی انہی حالات سے نمٹنا پڑا جن سے ہم دوچار ہیں' البتہ ان کا "اپروچ" ہم سے مختلف رہا۔ انہوں نے ہر لیول پر اپنے اندرونی اتحاد کو مضبوط کیا اور ہماری طرح بگاڑا نہیں۔

آزادی ملنے کے پہلے کے دور میں ان کے یہاں (یعنی اسرائیل اور بھارت میں بھی) کافی آپس کے جھگڑے تھے مگر آزادی مل جانے کے بعد وہ پچھلی یادیں اور تلخیاں بھول کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے اور اپنے ملکوں کی تعمیر میں منہمک ہوگئے۔ کسی نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کسی نے کسی کو ذلیل اور رسوا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی نے اپنے لیے جگہ پیدا کرنے کی خاطر آئینی خلا پیدا کر کے اپنی ملکی عوام کو ان کے انسانی حقوق سے محروم رکھنے کی نیت سے ایسی فضا پیدا نہیں کی کہ جمہوری سیاست کی جڑیں ہی لگنے نہ پائیں۔

جب آزادی مل جاتی ہے تو کام اتنا ہوتا ہے کہ ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ نظر میں وسعت اور نیت نیک ہو۔

یہ نہیں تھا کہ اسرائیلی سب شروع سے ہی صیہونی یا زائنسٹ خیالات کے تھے۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ سب ایک ہی ملک سے آئے تھے۔ یا ایک ہی زبان بولتے تھے۔ یا ایک ہی کلچر کی پیداوار تھے۔ فلسطین میں رہنے والی یہودی آبادی تو قلیل تھی۔ اکثر لوگ باہر کے ملکوں سے وہاں آکر بسنے لگے تھے' البتہ فلسطین پہنچ جانے کے بعد

انہوں نے اپنی قوتیں ذاتی جھگڑوں کو بڑھانے پر ضائع نہیں کیں۔ ان کا ہر شخص اپنے ملک کی تعمیر‘ اپنی ریاست کے دفاع اور جمہوریت کو مستحکم کرنے کے کام میں لگ گیا۔ اور یہ تینوں کام انہوں نے مل کر اس قدر مستعدی‘ جفاکشی اور خلوص سے سرانجام دیئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا چھوٹا سا ملک اس قابل ہو گیا کہ ساری عرب اور اسلامی دنیا مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

اسرائیل یقیناً ہمارا دشمن ہے مگر کبھی کبھی انسان بعض باتوں پر دشمن کو بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کی اس قدر ترقی اور کامیابی کا راز تین باتوں میں مضمر نظر آیا۔

(1) اندرونی اتحاد و تنظیم۔

(2) خلوص و عزم۔

(3) جمہوریت جس کے ہوتے چند لاکھ کی آبادی کا مقابلہ غیر جمہوری حکومتوں کی پامال کردہ کروڑہا کی آبادی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

پھر بھارت پر نظر ڈالئے۔

جن پرانے لوگوں نے آزادی سے پہلے کے دور کی سیاسی لڑائیاں اور لیڈروں کی باہمی رقابتیں دیکھی ہیں۔ ان کو یاد ہو گا کہ اس زمانے میں ساری ہندو قوم‘ بلا تفریق کسی وقت بھی کانگریسی علم کے تحت جمع نہیں ہو سکی تھی۔ ان میں مہا سبھائی بھی تھے‘ سنگھٹنی اور ساورکری بھی تھے‘ اچھوتوں کی کروڑوں کی آبادی بھی تھی‘ اکالی بھی تھے‘ انگریز سے وفادار لوگ بھی تھے‘ سرمایہ دار بھی تھے‘ کمیونسٹ بھی تھے‘ دراوڑی صوبہ پرست بھی تھے‘ راجے اور راجوڑے بھی تھے‘ انقلابی اور تشدد پسند بھی تھے اور سپرو اور جیکر جیسے نرم خیال کے ہندو لیڈر بھی تھے (فی الحقیقت ان کے اندرونی اختلافات کی گہرائی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ہندو ہی نے مہاتما گاندھی جیسی عظیم ہندو شخصیت کو سربازار قتل کر ڈالا۔)

مگر جب بھارت آزاد ہوا اور حکومت کانگریس پارٹی کے حوالے ہو گئی تو اس نے کیا راستہ اختیار کیا؟ انتقام اور ایک دوسرے کی رسوائی کا یا باہمی آشتی کا؟

اس نے کوشش کی کہ ماضی کی تلخیاں بھول کر ہر مخالف اور موافق سے ‘اس

کی صلاحیت کے مطابق قوم کا کام لیا جائے اور اس کو خدمت کا موقع دیا جائے تاکہ بھارت کی تاریخ کے اس نئے دور میں جملہ عناصر جمع ہو کر ایک متحد اجتماعی قوت بن جائیں۔

اچھوتوں اور کانگریس کے درمیان آخر تک کشمکش جاری رہی۔ ڈاکٹر امبیدکر اچھوتوں کا قائد تھا۔ اس نے گاندھی جی کی زندگی اس حد تک تلخ کر رکھی تھی کہ ان کو مرن برت رکھنا پڑا تھا...... مگر جب کانگریس راج شروع ہوا تو اسی دشمن امبیدکر کو وزیر بنا کر بھارت کا آئین اس سے لکھوایا گیا۔

راجہ گوپال آچاری کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ گاندھی جی سے شاکی اور نہرو اور پٹیل کی پالیسیوں کے شدید مخالف بن گئے تھے..... مگر اسی نہرو نے اس راجہ گوپال آچاری کو آزاد ہندوستان کا پہلا (دیسی) گورنر جنرل بنا دیا۔

پارسی صنعت کار بھابھا کبھی کانگریس کے قریب نہیں گیا‘ کبھی آزادی کی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ مگر اب اسی بھابھا کو مرکزی وزیر بنا کر صنعت اور ملکی معیشت کو سدھارنے کا کام اسی کے سپرد کر دیا گیا۔

سر ہومی مودی بمبئی کا دوسرا سربرآوردہ پارسی ہمیشہ انگریز کا پرستار رہا تھا۔ میں نے خود اس کو 1923ء میں گورنر بمبئی فریڈرک سائکس کے سامنے غلامانہ زبان میں سپاسنامہ پڑھتے سنا جس کے ہر جملہ کی انتہا تجدید وفاداری کے اعلان اور کانگریس سے نفرت کے اظہار پر ہوتی تھی..... مگر اسی سر ہومی مودی کو کانگریس نے آزادی کے بعد جواہر لال کے گھر کے صوبے یوپی کا گورنر بنایا۔

بلدیو سنگھ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے وابستہ رہا تھا۔ اسی شخص کو کانگریس نے مرکزی وزیر بنا کر ملکی دفاع اس کے حوالے کر دیا۔

سر گرجا شنکر باجپائی انگریزی دور کا وہ افسر تھا جس نے ساری زندگی انگریز کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر قدم پر کانگریس کی مخالفت کی تھی اور اس وجہ سے کانگریسی حلقوں میں بے حد بدنام رہا تھا مگر چونکہ اس میں کچھ خاص صلاحیتیں تھیں‘ لہٰذا ان سے ملک کو فائدہ پہنچانے کے لیے اس کو کانگریسی کابینہ کا سیکرٹری جنرل بنا کر اس پوزیشن میں کر دیا گیا کہ ہر داخلی‘ خارجی معاملہ میں اس کا مشورہ حرف آخر سمجھا

جانے لگا۔ پنڈت نہرو نے 1950ء میں مجھے خود اس کے پاس بھیجا کہ میں اس کو جا کر قائل کروں کہ لیاقت نہرو پیکٹ دونوں ملکوں کے مفاد میں ہوگا۔ اس سر گرجا شنکر کا ریٹائر ہونے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑا گیا اور اس کو بمبئی جیسے اہم صوبے کا گورنر مقرر کر دیا۔

کتنی مثالیں عرض کروں۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ اور اسی نوع کی بہت سی چیزیں مرکز میں تو ہوتی رہیں مگر نیچے کی لیول پر یعنی صوبوں میں بھی اسی FORGET AND FORGIVE کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا۔

غرض اس دور کی کانگریسی لغت سے ''غدار'' ''ملک دشمن'' ''تخریب کار'' ''کوئسزلنگ'' جیسے تفریق بڑھانے والے الفاظ قطعاً نکال دیئے گئے تھے۔ انہوں نے اپنی حکمت عملی کی بنیاد اس مفروضہ یا اصول پر رکھی تھی کہ "ماضی میں سیاست میں اختلافات کا ہونا جائز اور ناگزیر تھا مگر اب جبکہ بھارت آزاد ہو گیا ہے تو یہ فرض کر لینا چاہیے کہ اس کا کوئی باشندہ غدار یا ملک دشمن یا تخریب کار نہیں ہو سکتا ہے۔'' ایک مرتبہ بھارت کے صدر بابو راجندر پرشاد نے پاکستانی ایڈیٹروں کے وفد کے اعزاز میں اپنے محل میں بڑے پیمانے پر گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اس سرکاری پارٹی میں' میں نے ایسے بھارتی ایڈیٹروں اور سیاسی کارکنوں کو بھی اعزازی جگہوں پر بیٹھے دیکھا جن کو میں پہلے ذاتی طور پر جانتا تھا اور جنہوں نے گزشتہ زمانہ میں جی بھر کر کانگریس کی مخالفت اور اس کے لیڈروں کی تضحیک کی تھی مگر آج کے دن سب اکٹھے تھے اور میں نے صدر بھارت نیز وزیراعظم کو ان کا خاص احترام کرتے دیکھا۔

اب اس کے مقابلے میں انہی دنوں ہمارے یہاں کیا ہوتا رہا وہ اگلے ہفتے عرض کروں گا۔

مناسب ہے کہ اس مضمون کو فی الحال حفاظت سے رکھا جائے اور آنے والے مضمون کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔

جمہوریت اور سیاستدانوں سے سلوک کے نمونے

پاکستان بن جانے کے بعد شروع ہی سے ہم کو یہ اصول ملحوظ رکھنے تھے۔

(1) اللہ پاک کا حکم ہے کہ اپنے غصے پر قابو رکھو اور احسان کرو' انسانوں پر (یہاں لفظ ''انسان'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔)

(2) ہمارے پیغمبر صلعم کا وہ سلوک جو انہوں نے فتح مکہ کے بعد اپنے پرانے دشمنوں تک سے روا رکھا۔

(3) ہمارے قائداعظمؒ کے ارشادات' پاکستان دستور ساز اسمبلی کی اولین نشست کے سامنے' ان کے الفاظ یہ ہیں:

> ''ایک حکومت کی اولین ذمہ داری امن وامان کو برقرار رکھنا ہوتا ہے تاکہ مملکت کی طرف سے اپنے باشندوں کی جان و مال اور مذہبی عقائد کی پوری حفاظت کی جا سکے۔ اس تقسیم میں ایک یا دوسری ڈومینین میں اقلیتوں کا باقی رہنا ناگزیر تھا۔ ہمیں اپنی ساری توجہ لوگوں بالخصوص عوام اور غریبوں کی بہبود پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ آپ کا تعلق کس مذہب یا ذات یا عقیدہ سے ہو اس کا کاروبارِ مملکت سے کوئی تعلق نہیں' ہم اس بنیادی اصول سے آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک مملکت کے شہری اور مساوی شہری ہیں۔ میرے خیال میں اب ہمیں اس بات کو بطور

نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیے اور وقت گزرنے پر آپ دیکھیں گے کہ ہندو' ہندو نہیں رہیں گے' مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے' مذہبی لحاظ سے نہیں کیونکہ وہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ مملکت کے شہریوں کے طور پر سیاسی لحاظ سے۔"

(قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تقاریر بطور گورنر جنرل صفحہ 9-7)

اس سے وسیع اور بہتر چارٹر کسی نئی ریاست کو پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے تصور میں آنا مشکل تھا۔

مگر قائداعظمؒ کا انتقال ہوتے ہی یہاں WITCH HUNTING کی ابتداء ہوگئی۔ غدار سازی کے کارخانے کھل گئے۔ جس اپنے پرائے کو سیاست سے بھگانا مقصود تھا' اس پر "غدار" اور "پاکستان دشمن" کا لیبل چسپاں ہونے لگا۔

جو الفاظ ہم یہاں کے رہنے والوں نے شاید ہی کبھی سنے تھے وہ یکایک مروج ہوگئے ...... "غدار" ...... "ملک دشمن" ...... "سبوتیژ" ...... "کوئزلنگ" ...... "تخریب پسند" (بھارت کا جاسوس) یعنی پچھلی عالمی لڑائی کے دوران میں اتحادیوں نے جو الفاظ اپنے دشمنوں کی تذلیل اور دل آزاری کے لیے گھڑ لیے تھے وہ ہم نے بغیر سوچے سمجھے اپنی سیاسی لغت اور اخباری زبان میں شامل کر لیے اور ان کا استعمال اس سارے عرصے میں ہمارا روزمرہ کا مقبول ترین مشغلہ بنا رہا (اعتبار نہ آئے تو اس دور کے اخبارات کے فائل اور تقریروں کا ریکارڈ ملاحظہ کر لیجیے۔)

اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ رہی کہ جس شخص کو آج غدار قرار دیا کل اسی کو بشرط ضرورت گلے لگالیا' پھر الٹا کر دیا' پھر سیدھا کر دیا' پھر جیل میں ڈال دیا' یا پروڈا کے تحت خارج کر دیا۔ پھر اس کو کسی نہ کسی بڑے عہدے پر بٹھا دیا!

غرض اکھاڑ پچھاڑ' الٹ پلٹ' باہمی آبروریزی اور دل آزاری کا یہ سلسلہ برابر 1970-71ء تک جاری رہا اور جو وقت اور قوت قوم کے مختلف "طفلان گریزپا" کو درس محبت و مودت دے کر اپنے ساتھ ملا کر قومی تعمیر کے کام میں لگا دینے پر صرف ہوتی تو داخلی انتشار' باہمی تلخیوں اور جمہوریت کی پراگندگی کے وہ مناظر سامنے نہیں آتے جو پاکستان کے دشمنوں کے لیے باعث خوشنودی اور دوستوں کے لیے وجہ دل

گرفتگی بنتے رہے۔

افسوس یہ ہے کہ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس عمل کے نتائج آگے چل کر قومی اتحاد و تنظیم اور جمہوریت کے حق میں کیا ہونے والے ہیں۔

زبان سے تو سب پاکستان کا بھلا چاہتے تھے اور کہتے یہ تھے کہ وہ قوم کو "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" بنانا چاہتے ہیں مگر وہ عملاً اپنی غیر مآل اندیشی سے' اس دیوار میں ایسے شگاف ڈالتے رہے جن کی نہ مرمت ہو سکتی تھی نہ ان کو چھپایا جاسکتا تھا۔

ہاتھ کے زخم مندمل ہو سکتے ہیں' زبان کے چرکے ناسور بن جاتے ہیں۔ آدمی جسمانی اذیت بھول سکتا ہے' مگر بے آبروئی بھول نہیں سکتا۔ انسان آخر بشریت کے تقاضوں کے سامنے مجبور ہی رہتا ہے۔

یہ مشغلہ غدار سازی کا صرف زبانی جمع خرچ تک ہی محدود ہی نہیں رہا بلکہ بات اس سے بھی بہت آگے بڑھ گئی۔ مثلاً منتخب عوامی نمائندوں کو بے آبرو اور مجبور کر کے نوکر شاہی کے قدموں میں ڈال دینے اور اس طرح سے جمہوری سیاست کو ناکام بنانے کے مقصد سے' درون خانہ نوکر شاہی کے ہی ایما پر قائداعظم کے انتقال کے بعد (ان کی زندگی میں اس قسم کے "قانون" بنانے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی) ایک خاص قانون پروڈا بنایا گیا جس کا بظاہر مقصد تو انتظامی بدعنوانیوں کا احتساب تھا مگر نتیجہ کے اعتبار سے اس کا حقیقی مقصد یہ لگتا تھا کہ منتخب قومی نمائندوں وزیروں وغیرہ کی داڑھیاں مستقلاً نوکر شاہی کے ہاتھوں میں دے دی جائیں تاکہ وہ (وزیر) اپنی آبرو بچانے کی خاطر نوکر شاہی کے آدمیوں سے اختلاف نہ کر سکیں۔

یہ پہلا قدم تھا' اولاً جمہوریت کو نوکر شاہی کا تابع فرمان بنانے کے لیے اور ثانیاً دنیا کے سامنے پاکستانی عوام اور پبلک لائف کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے ...... پروڈا کی کارگزاریوں کے ذریعے یہ دکھا کر کہ پاکستان کے عوام بالعموم ایسے آدمیوں کو منتخب کرتے ہیں جو بددیانت اور بدعنوان ہوتے ہیں اور ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کو پکڑنے کے لیے ایک خاص قانون بنانے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

ایسا "قانون" دنیا میں کہیں نہیں بنا تھا' حالانکہ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ دنیا کی جملہ جمہوریتیں (بھارت سمیت) فرشتوں پر مشتمل تھیں اور ان کے خلاف کبھی بدعنوانی

کی شکایتیں نہیں ہوئیں اور یہ کیفیت محض پاکستان میں رونما ہوئی تھی کہ پاکستان بنتے ہی ایک سال کے اندر اندر اکثر سیاستدان بدعنوان بن گئے تھے جن کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے ایک خاص قانون کی ضرورت محسوس ہوگئی تھی! کون سی جمہوریت میں بدعنوانی کی شکایتیں نہیں ہوئیں؟ امریکہ کے کتنے صدور کے خلاف بدعنوانی کے الزامات اٹھے؟ (ایک پوری کتاب ہے اس مضمون پر) برطانیہ کے وزیراعظم لائیڈ جارج پر الزام آیا کہ اس نے القاب بیچے ہیں' وہیں مارکونی کمپنی کے شیئرز پر بڑے ہنگامے ہوتے رہے' کرچل ڈاؤن کے پلاٹوں میں ہیرا پھیری ہوئی اور وزیر ڈگڈیل زیرِ عتاب آیا' جنوبی امریکہ تو سرتاپا مجسمہ' اسکینڈل بنا رہا ہے مگر کہیں "پروڈا" جیسا "قانون" نہیں بنا! کسی ملک نے اپنے جمہوری کارکنوں کو من حیث الجماعۃ' دنیا کے سامنے اس طرح سے رسوا کرنے کے لیے یہ اہتمام نہیں کیا۔

یہ صحیح اور مناسب چیز ہے کہ منتخب نمائندوں کا احتساب ہو' مگر جمہوری نظام کے تحت اس کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے ..... مثلاً:

(1) ہر تیسرے چوتھے سال بلاتکلف بلاناغہ نئے انتخابات ہوتے ہیں اور عوام کو موقع ملتا ہے کہ وہ غلط آدمیوں کو نکال کر نئے آدمی منتخب کر کے بھیجیں۔

(2) انتخابات کی کشمکش کے دوران مخالف و موافق پروپیگنڈہ ہوتا ہے جس سے ہر امیدوار کی پچھلی کارکردگی کی تصویر کے دونوں رخ عوام کے سامنے آتے رہتے ہیں اور وہ اپنے ووٹ کے ذریعے آخری فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس کو منتخب کیا جائے اور کس کو رد کیا جائے۔

(3) اخبارات کو کامل و مکمل آزادی ہوتی ہے اور وہ سارا وقت غلط وزیروں اور بدعنوان منتخب نمائندوں کی پردہ دری کرتے رہتے ہیں اور عوام کو آگاہ کرتے رہتے ہیں کہ ان کے نمائندے کیا کچھ کر رہے ہیں۔

(4) اسمبلیوں اور کونسلوں میں اپوزیشن پارٹیاں ہوتی ہیں جن کا کام بھی یہی ہے کہ وہ برسرِ منصب وزیروں کے عیوب کو اچھال کر عوام کو باخبر رکھیں۔

(5) سالانہ بجٹ پر بحث کے دوران وزیروں پر سخت سے سخت نکتہ چینی کی آزادی ہوتی ہے۔

(6) عدمِ اعتماد کی تحریک یا بجٹ میں ایک روپیہ کی تخفیف کے ذریعے وزیروں کو کسی وقت بھی برطرف کیا جا سکتا ہے۔

(7) عوام ہر وقت جلسوں' جلوسوں' ہڑتالوں کے ذریعے وزیروں کی زندگی تلخ کر سکتے ہیں۔

غرض منتخب نمائندوں کے احتساب کے اِس طریقہ' کار کے تحت' اپنے نمائندوں سے بازپرس کا کام انہیں عوام کے اختیار میں ہی رہتا ہے۔ جنھوں نے انہیں منتخب کیا ہوتا ہے ..... یہ نہیں ہوتا کہ نمائندہ میرا اور اس کی داڑھی دوسروں کے ہاتھ میں ہو ..... پروڈائی طریقے سے منتخب نمائندوں کی ذمہ داری اپنے منتخب کرنے والے عوام سے ختم ہو جاتی تھی اور جمہوریت اور عوامی نمائندگی کے بنیادی مقاصد فوت ہو جاتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ احتساب کا عمل بدنیتی پر مبنی نہ ہو اگر احتساب کی بنیاد بدنیتی پر مبنی ہو تو اس کا اثر الٹا ہی نکلتا ہے اور اس سے احتساب کرنے والوں کی اپنی ساکھ مجروح ہو جاتی ہے۔

اب پروڈا کے فضائل اور اس کی ابتداء اور پھر انتہا پر نظر ڈالیے۔

پروڈا کی مشینری کو حرکت میں لانے کے لیے طریقہ یہ رکھا گیا کہ کسی جھوٹی سچی شکایت پر مرکزی حکومت کا مقرر کردہ گورنر' اپنے کسی وزیر کو ڈسمس کر کے اپنی مرضی کا ٹریبونل بٹھا کر اور اس سے رائے لے کر مرکزی حکومت سے اس وزیر کو کئی سال کے لیے نااہل قرار دلوانے کا مجاز تھا۔

پروڈا کے مقدموں میں وزیروں کے خلاف ان کے سیکرٹری اور دوسرے زیردست گواہ بن کر آتے تھے اور اکثر یہ دکھاتے تھے کہ متعلقہ فائل پر ہم نے یہ رائے دی تھی اور اس سے اختلاف کر کے وزیر نے یہ فیصلہ دیا جس سے بدعنوانی واقع ہوگئی۔

یاد رہے کہ پروڈا کی کارروائیاں سارے پاکستان میں ہوتی رہیں مگر پاکستان بھر میں کسی سیاستدان کے خلاف' ہزار کوششوں کے باوجود' رشوت خوری کا الزام ثابت نہیں ہو سکا۔

رہا بدعنوانی کا الزام تو یہ ایک مبہم چیز تھی ..... مثلاً بدعنوانی کیا چیز ہے؟

بدعنوانی کا معیار کیا ہو؟ انتظامی امور میں کس فعل کو بدعنوانی قرار دیا جائے اور کس کو "خوش عنوانی" سے تعبیر کیا جائے؟ یہ ان افسروں اور ٹریبونلوں کی صوابدید پر منحصر رہا۔ وہ رات کو دن' دن کو رات قرار دے سکتے تھے یعنی رسی جس کی گردن میں فٹ آ جائے اس کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے!

میں نہیں کہتا کہ مرکز کے جن سیاستدانوں نے پروڈا بنایا ان کی نیت خراب تھی مگر پروڈا کا جو نتیجہ نکلا وہ کئی لحاظ سے افسوس ناک ثابت ہوا۔ مثلاً:

(1) عوام کے منتخب وزیر محض پروڈا کی بے آبروئی سے بچنے کی خاطر نوکرشاہی کی کاغذی کارروائی کو عوامی مفاد کے تقاضوں پر ترجیح دینے لگے اور اس طرح سے عوامی نمائندگی عملاً بے اثر اور نوکرشاہی عملاً مختار کل بن گئی۔ جمہوریت کو نوکرشاہی کے قدموں میں لٹا دینے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔

(2) منتخب اسمبلیوں کو بیکار بنا دیا کیونکہ جب اپنے وزیروں پر احتساب کا اختیار ان کے پاس نہیں رہا (جو جمہوری اصولوں کے تحت اسمبلیوں کا بنیادی حق تھا) اور یہ کام اوپر ہی اوپر ہونے لگا تو اسمبلیاں محض نام کی رہ گئیں۔

(3) صوبوں میں لوگوں کے مابین اختلافات کو شہ مل گئی۔ جب احتساب کا اختیار عوام کے پاس نہیں رہا اور وزیروں کی تقرری و موقوفی' عوام کے ووٹوں پر منحصر نہیں رہی بلکہ اوپر والوں کے ہاتھوں میں آ گئی تو وزیروں کے مخالفوں کے پاس یہی ایک حربہ رہ گیا کہ وہ جا بے جا شکایتوں کا طوفان کھڑا کر کے پروڈا کے تحت ان کو پکڑوا کر سیاسی میدان سے نکلوا دیں...... اور یہی ہونے لگا اور بڑے پیمانے پر ہوتا رہا...... مثلاً ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سندھ کا کوئی چلتا پھرتا سیاستدان (میرے علاوہ) ایسا نہیں رہا جو پروڈا کے تحت نااہل نہیں قرار دیا گیا۔ غرض ایک ایسی افراتفری پھیل گئی کہ صوبوں میں جمہوریت کی چولیں ہل گئیں اور صوبوں میں مرکز کے بارے میں کئی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔

اور یہی نوکرشاہی کا حقیقی مقصد تھا جس کے لیے انہوں نے پروڈا کا نسخہ بنوا لیا تھا۔

(4) جس طرح اوپر عرض کیا جا چکا ہے' پروڈا کی جملہ ہنگامہ آرائیوں کے باوجود کسی ایک سیاستدان کے خلاف بھی رشوت خوری کا الزام ثابت نہیں ہو سکا

اور یہ بہت ہی اہم نکتہ ہے۔

(5) پورے پانچ چھ سال یہ ڈرامہ ہوتا رہا اور سارا عرصہ دنیا کے سامنے پاکستان کی تذلیل اور پاکستانی جمہوریت کی تحقیر ہوتی رہی۔ باہر کے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ عجیب اسلامی ملک بنا ہے جس کو چلانے والے سیاستدانوں کی اکثریت صرف ایک سال کے اندر ہی اس قدر بددیانت اور بدعنوان ثابت ہو رہی ہے!

(6) چھ سال بعد دیکھا گیا کہ یہ "قانون" خود ہی خلاف قانون پاس ہوا تھا لہٰذا اس کو منسوخ اور اس کے مجروحین کو اس کی پابندیوں سے آزاد سمجھا گیا۔ بلاوجہ سیاستدان چھ سال بے آبرو ہوتے رہے۔ لاکھوں روپیہ طرفین کا وکیلوں اور کاغذوں پر ضائع ہوتا رہا۔ مثلاً کھوڑو مرحوم کو اپنی طرف سے وکالت کے لیے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس سر اقبال احمد کو بلانا پڑا جس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ پاکستان بھر میں مجموعی طور پر کتنی دولت اس ڈرامہ پر خرچ ہوئی ہو گی!

(7) البتہ پروڈا کی افادیت' نوکرشاہی اور شخصی حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے ایک بار ثابت ہو چکی تھی' چنانچہ جیسے ہی فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم کا دور آیا اور سیاست کے میدان کو سیاستدانوں سے خالی کرانے کی پھر ضرورت محسوس ہوئی تو اسی پروڈا کی طرز پر "پوڈو اور ایبڈو" بنائے گئے جن کے تحت سہروردی مرحوم' قیوم خان مرحوم' دولتانہ صاحب اور دوسرے چوٹی کے رہنماؤں کا کام تمام کر دیا گیا۔ (تفصیل وقت پر آئے گی) اور اس ایبڈو کی برکت سے سیاست کا میدان فیلڈ مارشل مرحوم اور ان کے چمچوں کے لیے کھلا رہ گیا جو پورے دس سال ملک پر مسلط رہے...... تاوقتیکہ "چینی چوری" کی منزل نہیں آئی۔

(8) جن معتوب یا "بدعنوان" قومی نمائندوں کو پروڈا کے تحت نااہل ثابت کر دیا گیا تھا وہ پروڈا منسوخ ہوتے ہی اپنے عوام کی مدد سے دوبارہ وزارتوں پر بیٹھ گئے اور ان کے بیٹھنے سے نہ تو کوئی زلزلہ آیا نہ پاکستان کے سر پر خدانخواستہ کوئی بم پھٹا۔

بہر حال یہ تھا سلوک جو پاکستان بنتے ہی سیاستدانوں سے ہونے لگا۔

اپنوں سے اپنوں نے کیا سلوک کیا؟

جمہوریت بغیر ان لوگوں کے جن کی پرورش سیاسی ماحول میں ہوئی ہو' نہیں چل سکتی تھی۔ شتربان سے آپ ہوائی جہاز نہیں چلوا سکتے' کشتی چلانے والے کے ہاتھ میں آپ ریلوے کا انجن ہرگز نہیں دے سکتے۔ طبیب کتنا ہی اچھا ہو' آپ اس سے بیراج کا پُل نہیں بنوا سکتے۔ انجینئر کتنا ہی تجربہ کار ہو آپ اس کو سول سرجن بنا کر اس سے آپریشن نہیں کروا سکتے۔ اسی طرح جمہوری سیاست کے بھی خاص تقاضے ہوتے ہیں جو سیاستدان ہی پورے کر سکتے ہیں۔

پاکستان بننے اور حضرت قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد چونکہ بعض عناصر کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں جمہوریت پنپنے نہ پائے تاکہ ان کے پاور میں آنے کے راستے کھل جائیں' ان کی کوشش یہ رہی کہ یہاں کے تجربہ کار سیاستدانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر اور ذلیل و خوار کر کے سیاسی میدان سے بھگا دیں۔

اس سوچی سمجھی پالیسی کے تحت پاکستان کے سیاستدانوں پر جو بیتی اس کی کچھ تفصیل عرض ہے:

(دوسرے نوزائیدہ آزاد ملکوں میں سیاستدانوں سے کیا سلوک ہوا اور کس طرح ماضی کو بھول کر ان سب کو اکٹھا کر کے ان سے ملک کی تعمیر کا کام لیا گیا' یہ میں پچھلے مضامین میں بتا چکا ہوں جس کے مقابلہ میں اب یہاں کی تصویر بھی ملاحظہ کر لیجئے۔)

مولوی فضل الحق مرحوم قرارداد پاکستان لاہور کے محرک تھے' ان کو "غدار" اور بھارت کا ایجنٹ قرار دے کر پہلے پاکستان کی سیاست میں قدم نہیں رکھنے دیا' بعد میں جب ان کو ان کے اپنے عوام نے سر پر اٹھا لیا تو طوعاً و کرہاً ان کو چیف منسٹر بننے دیا گیا۔ پھر ان سے نہیں بنی تو دوبارہ "غدار" کا لیبل لگا کر ان کو ڈسمس کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کے تعاون کی پھر ضرورت محسوس ہوئی۔ اب اسی "غدار" اور "بھارت کے ایجنٹ" کو مرکز میں وزیر داخلہ بنایا گیا اور اس کی خواہش پر بنگال کی گورنری اس کے سپرد کر دی گئی۔ بالآخر دوبارہ ان کو ڈسمس کر دیا گیا اور وہ جلد ہی فوت ہو گئے۔ نئے ملک کی تعمیر کا ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ وہ سارا عرصہ محض اپنی آبرو بچانے کی فکر میں رہے۔

یہ ہوا حشر پاکستان میں اس سیاستدان کا جس نے قرارداد پاکستان پیش کی تھی۔ ستر سال ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کی تھی۔ بنگال کے ہندوؤں سے زبردست مقابلے کیے تھے اور ان کی خدمات کے پیش نظر وہاں کے عوام نے ان کو شیرِ بنگال کا خطاب دیا ہوا تھا۔ ؎

خیال کن زگلستانِ من بہارِ مرا

شہید سہروردی مرحوم وہ شخص تھا جو بضد مشرقی بنگال کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے لڑ جھگڑ کر' لیجسلیٹرس کنونشن سے قرارداد منظور کروا کر مشرقی بنگال کو پاکستان میں لے آیا تھا۔ بہ حیثیت وزیر اعلیٰ متحدہ بنگال اس نے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران مسلمانوں کی اتنی خدمت اور حمایت کی تھی کہ وہاں کے ہندو آخر تک یہ زخم فراموش نہیں کر سکے' نہ صرف یہ بلکہ پاکستان تحریک کے زمانہ میں وہ سارا عرصہ مسلم لیگ بنگال کا جنرل سیکرٹری اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا روحِ رواں رہا۔

اس شخص کا کیا حال بنا؟ پہلے "غدار پاکستان" کے خطاب سے نوازا گیا' مسلم لیگ سے نکالا گیا اور ایسا ماحول پیدا کیا گیا کہ وہ پاکستان میں داخل ہونے ہی نہ پائے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہاں کی نوکر شاہی کے نامزد گورنر جنرل مرحوم غلام محمد کو اپنے جوڑ توڑ کو مقبول عام بنانے کے لیے اسی سہروردی کے تعاون کی شدید ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اس کو جنیوا سے بلا کر پاکستان کا وزیر قانون بنایا گیا اور ایک اور چکر

میں اس کو کچھ مہینوں کے لیے وزیر اعظم بھی بننے دیا گیا۔ آخر میں ایوب خان کا دور آیا تو اسی وزیر اعظم کو جیل میں ڈال دیا گیا اور "ایبڈو" کے تحت سیاست کے لیے نااہل قرار دے دیا۔

اس قدر بے آبروئی کے بعد وہ غریب جان چھڑا کر ملک سے ہی باہر نکل گیا اور وہیں جا کر مرنا بھی منظور کر لیا (حال ہی میں ان کی بیٹی بیگم اختر سلیمان کا اخباری انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں یہ راز کھولا گیا ہے کہ سہروردی مرحوم طبعی موت نہیں مرے تھے مگر ان کو نوکر شاہی نے مروایا تھا) اپنے اس لیڈر کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر مجیب الرحمٰن مستقبل کا بنگلہ بندھو' بنا اور وہ کچھ کر گیا جس کا رونا ہم آج تک "دو لخت ہو گیا' دو لخت ہو گیا" کہہ کر رو رہے ہیں۔

خواجہ ناظم الدین مرحوم سے زیادہ آڑے وقت میں کس نے قربانیاں دی تھیں یا مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی خدمت کی تھی؟ مثلاً جب ہندو اخبارات نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا تو اسی ناظم الدین نے اپنی جملہ آبائی جائیداد بیچ کر مسلمانوں کا انگریزی اخبار "اسٹار آف انڈیا" کلکتہ سے جاری کروایا تھا اور خود قلاش بن کر بیٹھ گیا تھا۔

قربانی کے ایسے مجسمے کو کس طرح بے آبرو کر کے ہمیشہ کے لیے سیاست سے نکال دیا گیا؟ اس کو ایسی حالت میں خلاف قانون اور خلاف شرافت پرائم منسٹری سے ڈسمس کیا گیا' جب وہ ہنوز مسلم لیگ پارٹی کے سربراہ تھے اور پارٹی کا مکمل اعتماد ان کو حاصل تھا۔ ڈسمس ہو جانے کے بعد اس معصوم انسان کے پاس نہ رہنے کا گھر اور نہ معاش کا کوئی ذریعہ رہا۔ عارضی طور پر کراچی کے ایک مخیّر شخص نے ان کی خستہ حالی پر رحم کھا کر ان کو سر چھپانے کے لیے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر دے دیا۔ میں جب سندھ کا ریونیو وزیر بنا تو وہ میرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کو تھوڑا سا غیر آباد زمین کا ٹکڑا سندھ میں دیا جائے جہاں وہ مرغبانی کر کے فاقہ کشی سے بچنے کا بندوبست کر سکیں۔ زمین تو میں نے دے دی مگر مرغی خانہ نہیں بن سکا۔ مجبوراً دربدر خاک بسر وہ اپنا یہ حال لے کر ڈھاکہ پہنچے اور وہاں پاکستان کے دوست دشمن قائداعظمؒ کے اس سب سے قریبی ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ آخر ان کا دل

ٹوٹ گیا اور وہ اپنی دردناک کہانی لے کر بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو گئے جس ملک کو بنانے میں ناظم الدین نے نمایاں حصہ لیا تھا' اس میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں نکل سکی۔

اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ معاشرے کی تطہیر کے مقصد سے بدعنوان اور بدکردار سیاستدانوں کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے مگر کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اس فرشتہ سیرت انسان سے کون سی بدعنوانی سرزد ہوئی تھی یا کیا رشوت اس نے کھائی تھی؟ سچی بات یہ تھی کہ اس مہم کا حقیقی مقصد تھا سیاستدانوں کو ذلیل اور پاکستانی جمہوریت کو دنیا کے سامنے رسوا کرنے کا اور اس دیوانگی کی زد سے اس پایہ کا سیاستدان بھی نہیں بچ سکا۔

حمید الحق چودھری تحریک آزادی کے زمانہ کے سرفروش مسلم لیگی ورکر اور بنگال کی اسمبلی پالیٹکس کے روح رواں تھے۔ آزادی کے بعد وہ وہاں صوبائی وزیر بھی بنے۔ ان کو وزارت سے نکال کر پروڈا کے تحت سیاست کے لیے نااہل قرار دیا گیا۔ مگر پھر اسی حمید الحق کو سارے پاکستان کا مرکزی وزیر خارجہ بنایا گیا۔ وہاں سے نکالے جانے کے بعد اس پر جو بیتی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے سیاست پر لعنت بھیج کر اپنے قانونی پیشے میں لگ گئے۔ پاکستان ایک ایسے دماغ کی خدمات سے محروم ہو گیا جس سے نہ صرف یہاں بلکہ بین الاقوامی دنیا میں بھی حیرت انگیز کام لیا جا سکتا تھا۔

مسٹر منڈل بنگال کے اچھوتوں اور مزدوروں کے لیڈر تھے۔ انہوں نے قائداعظمؒ کا ایسے وقت میں ساتھ دیا جب کوئی غیر مسلم ان سے تعاون کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ قائداعظمؒ نے پہلے ان کو مشترکہ آل انڈیا کابینہ میں اپنی طرف سے نامزد فرمایا اور بعد میں ان کو اپنی کابینہ کا رکن بنا کر یہاں لے آئے جب تک قائد زندہ رہے منڈل کی پاکستان سے وفاداری شک و شبہ سے بالاتر رہی' مگر قائدؒ کا انتقال ہوتے ہی وفاداریوں کی ناپ تول کا کام نوکر شاہی نے اپنے ذمہ لے لیا۔

چودھری محمد علی مرحوم و مغفور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انگریز کی ملازمت میں بسر کرنے کے بعد اب دہلی سے پاکستان تشریف لے آئے تھے اور آتے ہی بحیثیت سیکرٹری جنرل مرکز پاکستان میں نوکر شاہی کے معمار اور امام مانے جانے لگے۔ ابھی وہ کابینہ میں محض سیکرٹری تھے (ہنوز نہ وہ سیکرٹری خزانہ' وزیر خزانہ' نہ وزیر اعظم بنے تھے' ان کی

ترقی درجات کا یہ اہتمام بعد میں ہوتا رہا) بہرحال اس وقت وہ کابینہ کے سیکرٹری تھے ان پر (بقول خود) یکایک یہ انکشاف ہوا کہ منڈل کی ملک سے وفاداری مشکوک ہے جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ چودھری صاحب مرحوم مردم شناس اور وفاداری پر کھنے کے معاملے میں قائد سے بھی زیادہ تیز نظر رکھتے تھے' چنانچہ انہوں نے وزیر منڈل سے کابینہ کے اہم کاغذات چھپانے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ بات منڈل سے برداشت نہ ہو سکی۔ وہ خوددار پرانا ہندو سیاستدان تھا۔ تحریک آزادی کے دوران بڑی قربانیاں دے کر اور شدید مشقتیں برداشت کر کے خصوصاً آڑے وقت میں اپنی قوم کے خلاف ہمارے قائد کا ساتھ دے کر وزارت کے اس منصب تک پہنچا تھا' اب وہ کیونکر یہ توہین برداشت کر سکتا کہ کابینہ کا اپنا ملازم اس کے سیاسی کیریکٹر اور وفاداریوں کے بارے میں جج بن کر بیٹھے؟ وہ فوراً وزارت چھوڑ چھاڑ کر واپس کلکتہ چلا گیا اور بقیہ عمر وہاں ہندوؤں کے طعنے برداشت کرتا رہا کہ مسلمانوں سے تعاون کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ منڈل کے اس حشر کا مشرقی پاکستان کی ہندو آبادی پر خاص طور پر بہت ہی بُرا اثر پڑا اور وہ اسی دن سے پاکستانی سیاست سے مایوس ہو کر اپنی جان چھڑانے کے لیے سازشیں کرنے لگے جن کا نتیجہ آخری طور پر 1971ء والے حادثے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اب تک یہ ہندو قائداعظمؒ کی تسلی آمیز تقریریں سن کر قرارداد پاکستان کا اقلیتوں کے حقوق والا حصہ دیکھ کر کسی قدر امید و بیم کی کیفیت میں رہتے تھے مگر منڈل والے واقعہ کے بعد وہ قطعی طور پر پاکستان سے ناامید ہو گئے۔

صوبہ سرحد میں مرحوم سردار اورنگزیب نے اس وقت مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں جہاد کیا۔ جب ان کا نام لینے والا کوئی شخص وہاں نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے خود ابتدائی زمانہ میں وہاں بھیجا گیا تھا جو کچھ میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ اورنگزیب خان تنہا اپنی چھوٹی سی مورس موٹر میں (جس کا نام مولانا شوکت علی مرحوم نے ابابیل رکھا تھا) تحریک کو بڑھانے کے لیے صوبہ بھر میں دوڑ رہے تھے۔ کانگریسی وزارت کے عارضی طور پر مستعفی ہونے کے بعد (ابھی انگریز کا زمانہ تھا) یہی اورنگزیب اس قابل نظر آیا کہ وہاں کی مسلم لیگی وزارت اعلیٰ ان کے سپرد کی جائے یہاں تک تو اس کی خیر رہی مگر پاکستان بن جانے اور قائد کی رحلت کے بعد اسی اورنگزیب کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ بعد از

بسیار آہ و زاری ان کو تھوڑے سے عرصہ کے لیے سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیجا گیا مگر نوکر شاہی سفارت کے اعلیٰ عہدوں کو اپنی جاگیر قرار دے چکی تھی اور اپنے لولوں لنگڑوں کو ان میں کھپانے کے لیے سر سے کفن باندھے بیٹھی تھی۔ اس نے حسبِ عادت اس باہر کے سیاستدان سفارت کار پر بے سروپا اتہام لگا کر اس کو وہاں سے بھی نکلوا دیا۔ مقامی سیاست سے وہ پہلے ہی بے دخل کر دیئے گئے تھے۔ آخر بے چارہ مرتا مر گیا مگر سنبھل نہیں سکا۔

جو کام سرحد میں اورنگزیب نے کیا وہی کام صوبہ بلوچستان میں قاضی عیسیٰ مرحوم سرانجام دیتے رہے تھے جب تک قائداعظمؒ زندہ رہے' عیسیٰ مسلم لیگی ہائی کمانڈ کے ممبر بنے رہے۔ جب تک تحریک چلتی رہی اور پاکستان نہیں بنا تھا وہ ہندوستان بھر میں ہر فرنٹ پر استعمال ہوتے رہے مگر پاکستان بن جانے کے بعد ان کے لیے کوئی جگہ پیدا نہیں ہو سکی۔ سوائے ایک بیکار سفارت کے جہاں سے بھی وہ اورنگزیب خان کی طرح جلد ہی نکال دیئے گئے۔ نوکر شاہی نے وجہ یہ بتائی کہ اس کی باریک بین نظروں میں یہ چیز کھٹکنے لگی تھی کہ وہ غالباً بھتے بھاڑے کے غلط بل بنا رہے تھے جس شخص نے پاکستان کی خاطر اپنی جوانی اور اپنی بیرسٹری کی پریکٹس برباد کر ڈالی تھی' وہ آخر عمر میں سفر خرچ کے سلسلہ میں خورد برد کا مرتکب پایا گیا! سچ تو یہ ہے کہ ...... خوئے بد را بہانہ بسیار!

پنجاب جیسے کلیدی صوبہ میں مسلم لیگ کا پرچم کس نے اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ جب انگریز' ہندو' سکھ' یونینسٹ مسلمان سب مل کر لیگ اور پاکستان کے خلاف برسرِ پیکار تھے ......؟ نواب افتخار حسین ممدوٹ مرحوم' میاں دولتانہ' سردار شوکت حیات اور میاں افتخار الدین مرحوم نے پاکستان بن جانے کے بعد ابتدائی دنوں میں جب قائداعظمؒ ہنوز زندہ تھے' ممدوٹ مرحوم کے سر پر چیف منسٹری کی ذمہ داری ڈال دی گئی تھی اور تحریک آزادی کشمیر کے سلسلے میں کچھ نازک کام اس کے سپرد کیے گئے تھے مگر قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد جلد ہی اس کو وزارت سے نکال کر پروڈا میں پھنسا دیا گیا اور کافی رسوا کیا گیا۔

آگے چل کر گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کا دور آیا تو اسی معتوب ممدوٹ کو پھر گلے سے لگا کر سندھ کا گورنر بنا دیا گیا ...... اور پھر نکالا گیا۔

دولتانہ صاحب کو کچھ عرصہ کے لیے ممدوٹ کی جگہ پر چیف منسٹر پنجاب بنایا گیا۔ پھر اس سے استعفیٰ لیا گیا پھر اس کو مرکز میں وزیر بنایا گیا اور پھر نکالا گیا۔ ایوب خان کے دور میں اس کے خلاف ایبڈو کے تحت کارروائی کی گئی۔ اس نے لکھ کر دے دیا کہ پانچ سال تک وہ سیاست میں حصہ نہیں لے گا اور یہی چیز ایوب خان چاہتے تھے۔

میاں افتخار الدین مرحوم اور شوکت حیات پاکستان بنتے ہی غدار قرار دیئے گئے۔ کسی کی کیا مجال جو یہ پوچھ بیٹھے کہ جب تک پاکستان نہیں بنا تھا' یہ لوگ "غدار" نہیں تھے بلکہ تحریک کے سرفروش کارکن رہے اور اب جب پاکستان بن گیا اور اس سے غداری کا کوئی فائدہ نہیں رہا تھا تو وہ کیسے اور کس مطلب سے یکایک "غدار" بن گئے؟

ممکن ہے کہ انہوں نے کسی پالیسی کے معاملہ میں اختلاف کیا ہو مگر اختلاف رائے تو جمہوریت کی جان ہے۔ اختلاف رائے سے آدمی غدار کیسے بن سکتا ہے؟ کیا اپوزیشن پارٹیاں دنیا کی جملہ جمہوریتوں میں غدار سمجھی جاتی ہیں؟

پنجاب کے دوسرے نوجوانوں نے بھی تحریک کے دوران بڑی بڑی خدمات سرانجام دیں تھیں' مگر جب پاکستان کا دستر خوان بچھا تو ان کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی طرح پنجاب کی خواتین نے بھی پاکستان حاصل کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی تھی۔ پاکستان کا علم پنجاب کے سیکرٹریٹ پر ایک خاتون نے ہی نصب کیا تھا' مگر حصول پاکستان کے بعد ان خواتین کی کیا قدر شناسی ہوئی۔ یہ کام صدر محمد ضیاء الحق کے لیے چھوڑا گیا کہ وہ آکر پینتیس سال بعد اس بہادر خاتون (جس نے علم نصب کیا تھا) کی تالیف قلب کے لیے کچھ سامان کریں۔ ابوسعید انور کو کیا ملا؟ ظہیر الاسلام فاروقی کو کیا ملا؟ عبدالستار نیازی' عبدالسلام خورشید یا فاروق سیالکوٹی کو کیا ملا؟ محبوب قریشی کو کیا ملا؟ آفتاب قریشی کو کیا ملا؟ مسکین نسیم حسین کو کیا ملا؟ میاں باری مرحوم کو کیا ملا؟ ظفر علی خان یا مہر اور سالک کے سروں پر کون سے تاج رکھے گئے؟ وقار یا میکش کی خدمات کو جاری رکھوانے کے لیے کون سی گنجائش نکالی گئی؟ حمید نظامی مرحوم کو کیا انعامات ملے؟ (سوائے جھوٹے مقدمات' تلاشیوں اور ضبطیوں کے) یہ اور کئی اور ایسے ورکر پنجاب میں تھے جن کی مختلف محاذوں پر خدمات کے بغیر پنجاب کو ان خصوصی حالات میں پاکستان کے نظریہ کی طرف لانا قطعاً ناممکن تھا۔ میں جانتا ہوں کہ ان لوگوں نے کسی

انعام واکرام کے لالچ پر تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا مگر پاکستان بن جانے کے بعد ان کو یک قلم فراموش کر دینا اور ان کو پاکستان کی تعمیر میں حصہ لینے کا مناسب موقع نہ دینا خود اسی نوزائیدہ ملک کے حق میں کہاں تک مفید تھا؟ یہ وہ لوگ تھے جن میں سے ہر ایک شخص کسی نہ کسی شعبۂ زندگی میں' اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس نئے ملک کو فائدہ پہنچانے کا اہل تھا۔ ان کے پاس تجربہ تھا۔ وہ تحریک کے مقاصد اور مضمرات سمجھتے تھے اور انہوں نے قربانیاں دے کر اپنا خلوص ثابت کیا ہوا تھا۔ کیا پاکستان بنتے ہی یکایک ان کی جملہ صلاحیتوں پر پتھر پڑ گئے تھے کہ ان کو مزید کسی ملکی کام کے لیے ناکارہ سمجھ کر کباڑ خانہ میں پھینک دیا گیا؟

ایک اور مثال اس ضمن میں عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ غلام احمد پرویز کو میں نے اس زمانہ میں دیکھا جب تحریک پاکستان کے اولین پودے لگائے جا رہے تھے اور کوئی مسلمان سرکاری ملازم اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ چھپ چھپ کر بھی اس تخیل کی تائید میں زبانی طور پر ہی دو لفظ ہمدردی کے اپنے منہ سے نکال سکے۔ ان لاپرواہ اور غیر ہمدرد مسلمان سرکاری ملازموں میں وہ چالاک پاٹے خان بھی شامل تھے جو بہت بعد میں اپنے انگریز آقا کو ہندوستان سے فرار ہوتے دیکھ کر آخری دنوں میں مجبوراً مسلم لیگ کی قیادت سے چمٹ گئے تھے اور ان کے پاؤں چومنے لگے تھے اور قیام پاکستان کے بعد دہلی سے یہاں آکر عملی طور پر سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے اور پرانے مسلم لیگی ورکروں کی پاکستان سے وفاداریاں یا غداریاں تولنے ناپنے لگے تھے۔ مقابلتاً پرویز صاحب جو اس زمانے میں وائسرائے کی کابینہ کے ڈپٹی سیکرٹری ہوتے تھے' اپنی نوکری یا انگریز اور ہندوؤں کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلم لیگی حلقوں میں پھرتے اور ورکروں کے حوصلے بڑھاتے رہتے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسی شام ہوتی تھی جب یہ مسلم لیگی کیمپ کا چکر نہ لگاتے تھے۔ سرکاری ریکارڈ سے متعلق' خصوصاً اعداد وشمار کے بارے میں جس قدر معلومات کی ضرورت ہوتی تھی یہ فراہم کرتے رہتے تھے۔ ویسے یہ اپنی جگہ پر ایک عالم بھی تھے (ان کے بعد کے عقیدوں سے کسی کو کتنا ہی اختلاف یا نزاع ہو) ان کے مبلغ علمی سے پاکستان بن جانے کے بعد بھی' کئی شعبوں میں کافی فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا' مگر میں نے نہیں سنا کہ اس ملک میں ان سے صحیح تعمیری

کام لینے کے لیے بھی کوئی گنجائش پیدا کی گئی ہو۔ ان کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ مولویانہ مسائل سے متعلق موشگافیوں میں منہمک رہیں حالانکہ اس اسلامی ملک میں انگریزوں' مسیحیوں' ہندوؤں اور آتش پرستوں اور احمدیوں کی صلاحیتوں سے بھی استفادہ اٹھایا جاتا رہا۔ حقیقی معیار یہ رہ گیا کہ نوکر شاہی کو کون پسند ہے اور کون ناپسند ہے؟ پاکستانی مکھن کا پیڑا نوکر شاہی کی بندریا چرا کر پیڑ پر جا بیٹھی اور مکھن کے مالک نیچے منہ تکتے رہ گئے! ان کے لیے سیفٹی ایکٹوں کی موجودگی میں اتنا کہنا بھی ممکن نہیں رہا جتنا فردوسی محمود غزنوی کے حق میں کہہ سکا تھا۔

اگر مادر شاہ بانو بُدے
مرا سیم و زر تا بزانو بُدے

پرویز صاحب کے ذکر کے سلسلے میں ایک بات میں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ سال 1939ء کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ان کا بعد کا لٹریچر میں نے قطعاً نہیں پڑھا ہے۔ ان کے عقائد سے بھی میں بالکل بے خبر رہا ہوں۔ میں نے ان کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ صرف ان کے پرانے سیاسی کردار اور نظریہ پاکستان سے ان کی وابستگی پر مبنی ہے۔

پیر صاحبان مانکی شریف و زکوڑی شریف نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا؟ مگر پاکستان بن جانے کے بعد کیوں یکایک ان کو دوسری پارٹیوں کی تلاش رہی یا قطعاً گوشہ نشین ہو جانا پڑا؟

جان کی امان پاؤں تو میں یہاں تک کہنے کی جرأت کروں گا کہ اگر صحیح خطوط پر کوشش ہوتی تو خود معتوب بارگاہ خان عبدالغفار خان کی صلاحیتوں سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ اگر اسکندر مرزا مرحوم بعد میں خان عبدالغفار خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو (جو سرحدی کانگریس وزارت کے چیف منسٹر اور پاکستانی پرچم کو سلام نہ کرنے کے اصلی مجرم قرار دیئے جاتے تھے) رام کر کے پاکستان کی مرکزی وزارت میں لا سکتے تھے۔ اور خیبر سے کراچی تک کا علاقہ یعنی سارا مغربی پاکستان ون یونٹ کے چیف منسٹر کی حیثیت میں ان کے حوالے کیا جا سکتا تھا تو یہ بھی قرین قیاس تھا کہ اسی ڈاکٹر خان صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالغفار خان صاحب پر وہی نسخہ کارگر ثابت ہو جاتا۔ اگر

بڑے میاں سبحان اللہ تھے تو چھوٹے میاں کیوں نعوذ باللہ رہے؟

مجھے تو یہاں تک بھی معلوم ہے کہ شروع میں خود خان عبدالغفار خان کی طرف سے اس سمت میں پیش قدمی کی کوشش بھی ہوئی تھی مثلاً انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے سامنے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھالیا تھا۔ یہاں کراچی میں آکر آمادگی ظاہر کی تھی کہ قائداعظمؒ سے ان کی ملاقات ہو جائے مگر بعض سازشی عناصر جو اس وقت سیاسی تخریب کاری میں لگے ہوئے تھے' عبدالغفار خان اور مسلم لیگ کے مابین افہام و تفہیم کو اپنے انتہائی مقاصد کے منافی سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں عبدالغفار خان کے پایہ کے آدمی کی پاکستانی سیاست میں عملی شرکت سے یہاں سیاستدانوں کا پلہ بھاری نہ ہو جائے اور جمہوری سیاست کو فیل کرنا ممکن نہ رہے۔ وہ مصالحت کی ان کوششوں میں حائل ہوتے رہے اور جو چند مہینے پاکستان بننے کے بعد قائد زندہ رہے' ان میں دونوں کو قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ آخر یہ بیچ کے لوگ بھی تو معمولی آفتیں نہیں ہوتیں!

اگر بہ نظر عمیق دیکھا جائے تو خان عبدالغفار خان کے معاملے میں بات صرف اتنی تھی کہ (1) ان کو قائد کے قریب آنے دیا جاتا' (2) ان کے ساتھ ان کے سیاسی مقام کے مطابق سلوک ہوتا' (3) ان پر کم از کم اتنا اعتماد ہی کیا جاتا جتنا اعتماد پاکستان کے روایتی دشمن انگریز کے پیچھے چھوڑے ہوئے انگریز گماشتوں (سر جارج کنہنگام' موڈی' گریسی' میسروی' میکفر کوہار' میجر ہارڈی اور دوسروں) پر کیا گیا حالانکہ سمجھنے کی بات یہ تھی کہ اگر یہ واقعہ تھا کہ انگریز پاکستان کا دشمن تھا تو اس کے ہم قوم سابق افسران جن کو بالآخر اپنوں کے یہاں ہی جا کر مرنا اور دفن ہونا تھا' کیسے پاکستان کے قابل اعتماد دوست بن سکتے تھے؟ مگر ہم کو اس بدیہی حقیقت کے باوجود ان پر اعتماد کرنا ہی پڑا تھا۔ (4) ماضی کو فراموش کر کے اگر وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کی خدمت کریں تو اُن کے لیے خدمت کے مواقع پیدا کیے جاتے۔ فارسی شاعر نے کیا اصول بتایا ہے۔

درسِ وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
طمع بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

سیاسی کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ماضی کو فراموش کرنا

ضروری ہوتا ہے۔ ماضی کو فراموش کرنا سیاست کے مردوں کا کام ہوتا ہے' سیاسی ہیجڑوں کا نہیں۔ پچھلی عالمی جنگ کے دوران اگر چرچل ایٹلی کا تعاون حاصل نہ کرتے یا سابق باغی امریکیوں کی سابق نو آبادیاتی لڑائیوں اور بغاوتوں کی یادوں میں ڈوبے ہوئے رہتے تو برطانیہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر چرچل اسٹالن جیسے دشمن سے ہم آغوش ہونا گوارا نہ کرتے تو ہٹلر کے مقابلے میں کس طرح بازی جیت سکتے؟

خود ہمارے قائداعظمؒ سیاسی معاملات میں کس قدر نہ وسعت قلبی دکھا رہے تھے؟

یہ قیوم خان مرحوم کون تھے جو بعد میں مسلم لیگ کے جرنیل تھے اور ایک قیمتی اثاثہ بنے رہے؟ قائداعظمؒ کے خلاف کتابچہ "گولڈ اینڈ گن" چھاپنے والے اور سنٹرل اسمبلی کانگریس پارٹی کے سابق ڈپٹی لیڈر!

سر غلام حسین مرحوم و مغفور کو قائدؒ نے پہلے سندھ کا چیف منسٹر اور بعد میں مختار کل گورنر بنایا مگر یہ انعامات ملنے سے پہلے ان کا کردار (مسلم لیگ سیاست کے سیاق و سباق میں) کیا رہا تھا؟ 1938ء میں وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ممبر بنے رہے۔ اگلے سال جب قائداعظمؒ اور مرحوم اللہ بخش کے دوران تصادم زوروں پر تھا' تو سر غلام حسین مرحوم موقع سے فائدہ اٹھا کر اسی اللہ بخش سے ہوم منسٹری لے کر مسلم لیگ کو کوسنے میں مصروف ہو گئے۔ بہ حیثیت ہوم منسٹر وہ منزل گاہ کی تحریک کے دوران مسلم لیگی لیڈروں اور ورکروں کو کچلنے کی خوب کوشش فرماتے رہے۔

مگر ماضی میں ایسے ریکارڈ کے باوجود جب ضرورت پیش آئی تو ہمارے قائدؒ نے عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے پہلے ان کو مسلم لیگ کا صوبائی وزیر اعلیٰ بننے دیا اور بعد میں سندھ کا گورنر بنا دیا۔

پیرزادہ عبدالستار مرحوم جب تک پاکستان نہیں بنا تھا' مسلم لیگ اور قائد کے ذاتی مخالف خان بہادر اللہ بخش مرحوم کے دست راست اور پارلیمانی سیکرٹری بنے رہے مگر جب پاکستان بن گیا اور پیرزادہ مرحوم نے سجدہ سہو پر آمادگی ظاہر کی تو ان کو فوراً سینے سے لگا لیا گیا اور قائداعظمؒ نے ماضی کی جملہ جراحتیں بھول کر براہِ راست ان کو اپنی کابینہ میں لے لیا اور وہ یقیناً مستقبل میں قابل اعتماد پاکستانی ثابت ہوئے۔

تعجب ہے کہ عبدالغفار خان کے بارے میں دوسرا پیمانہ ملحوظ رکھا گیا اور ان کو قائداعظمؒ کے قریب نہیں آنے دیا گیا۔ وہی اپروچ اور نیت کے صحیح ہونے کی بات تھی۔ ہر انسان کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہر بھینس کو آپ ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش نہیں کر سکتے' اپنے وفادار سے وفادار بھائی کو بھی اگر آپ صبح و شام اٹھتے بیٹھتے غدار کہتے رہیں گے تو کس منہ سے آپ اس سے وفاداری یا تقرب کی توقع رکھ سکیں گے؟

خان عبدالغفار خان نے تو غالباً اس وجہ سے بھی جلاوطنی اختیار کر لی کہ انہوں نے شروع کا سیاسی منظر دیکھ لیا تھا کہ یہاں سیاست دانوں کی کس طرح آبروریزی ہوتی ہے اور اپنے اپنوں سے اور مسلم لیگی مسلم لیگیوں سے کیا سلوک کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نظیری کا یہ شعر بھی پڑھ لیا ہو۔

تو بخود چہ کردی اے دل کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

سرحد کے قیوم خان مرحوم کو اس وقت تک مجبوراً سر پر اٹھائے رکھا جب تک سرحد کے حالات غیر تسلی بخش رہے مگر جیسے ہی حالات میں سکون پیدا ہوا' بڑی حکمت عملی سے اس کو وہاں سے نکال کر اس کی جگہ پر ایک پولیس آئی جی کو سرحد کا چیف منسٹر بنا دیا گیا۔ قیوم خان مرحوم کچھ عرصہ کے لیے مرکزی وزیر بھی رہے مگر آخر میں ان کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں ان کو دل کی بیماری لگی جو مستقبل میں ان کی موت کا باعث بنی۔

چودھری خلیق الزمان مرحوم کا احیاء ملت اسلامیہ کے سلسلے میں ستر سال پر پھیلا ہوا کام کون بھول سکتا ہے؟ قرارداد لاہور کے موید یہی شخص تھے۔ یو پی کے ہندو سیاسی درندوں کے مقابلے میں یہی مسلمان لیڈر سالہا سال ڈٹا رہا۔ پاکستان بننے کے بعد ایک خاص مقصد سے اس کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا وہ جیسے ہی پورا ہو گیا اس کے گھر پر کراچی کے "اوباشوں" سے بصورت جلوس یورش کرائی گئی اور اس کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ایک عرصہ تک وہ راندۂ درگاہ رہے' پھر گورنر جنرل غلام محمد مرحوم خود کو ہی چودھری صاحب کے حالِ زار پر رحم آ گیا اور اس کو عارضی طور پر گورنر مشرقی پاکستان' اور بعد میں سفیر بنانا گوارا کر لیا۔ وہاں سے سبکدوشی کے بعد وہ کئی سال بیکار پڑے

رہے۔ آخر فرشتۂ اجل ہی نے ایسی بے مقصد زندگی سے اس کو نجات دلائی۔ ع

جو کراہتا تھا تمام شب وہ غریب جوشؔ تو مر گیا!

اسی سلسلہ عالیہ سیاسیہ کی ایک زرین کڑی مرحوم و مغفور نواب اسماعیل خان کا وجود مسعود تھا۔ ان جیسا سنجیدہ تجربہ کار اور دانشور ' مدبر صرف کسی خوش نصیب قوم کے حصے میں آسکتا تھا۔ اگر وہ یہاں تشریف لانے پر آمادہ کیے جاسکتے تو پاکستان کی نیک نامی میں چار چاند لگ جاتے مگر یہاں کی لتاڑ پچھاڑ کی شہرت سن کر انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ بقیہ زندگی دشمنوں کے ملک میں ہی بسر کریں۔ ایک بار اتفاقیہ میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے پوچھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس ملک میں آکر رہنا کیوں گوارا نہیں کیا؟ جواب کچھ نہیں دیا صرف اپنے دل نشین انداز میں مسکراتے رہے۔ ظاہر تھا کہ وہ بزبان بے زبانی کہنا چاہتے تھے کہ جس ملک میں سیاست دانوں کو نوکر شاہی کے سانپ کاٹ رہے ہوں وہاں آکر وہ اپنے کو ان کے ہاتھوں بڑھاپے میں بے آبرو کیوں کرواتے؟

نمونتاً...... کھوڑو مرحوم کا حشر!

پچھلے ہفتے کے مضمون میں کسی قدر تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ پاکستان کے بعض اہم صوبوں کی تجربہ کار اور انتظامی امور میں مہارت رکھنے والی مقامی قیادتوں کو کس طرح ذلیل کر کے سیاست سے نکال دینے کی کوششیں ہوتی رہیں اور ان کوششوں کی تہہ میں یہ نیت کار فرما رہی کہ پاکستان سے جمہوری سیاست کی جڑیں اکھاڑ کر اس کی جگہ نوکر شاہی کا راج قائم کرنے کے لیے میدان ہموار کیا جائے۔

آج کے مضمون میں صوبہ سندھ میں سیاسی ٹیلنٹ (TALENT) کے سرمایہ کو ضائع کرنے کے لیے جو کچھ ہوتا رہا' اس کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

جہاں تک میں نے دیکھا اس دور کی پکڑ دھکڑ میں سندھ پر خاص طور سے نگاہِ خشمگین جمی رہی۔ وجوہات یہ نظر آئیں۔

1- سندھ قریب ترین صوبہ تھا اور بالکل پاؤں تلے واقع تھا۔
2- جرم ضعیفی کا مرتکب تھا۔
3- آسودہ حال تھا اور زیادہ سے زیادہ گنجائش کا حامل۔
4- اس کے مقامی لیڈر آپس میں لڑے ہوئے تھے۔

اس زمانے میں سندھ کا چیف منسٹر کھوڑو مرحوم تھا جو پرانی جمہوری روایات میں پلا ہوا قدرے دبنگ قسم کا سیاست کار تھا۔ سب سے اول اس کو راستے سے ہٹانے

کی مہم شروع ہوئی۔

یہ کھوڑو صاحب سارا عرصہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے وابستہ رہا تھا' سندھ کے ہندو زدہ صوبہ کو بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ کروانے کا سہرا اس کے سر رہا (اگر خدانخواستہ پہلے کی طرح سندھ بمبئی سے ملحق رہتا تو پاکستان کا نقشہ کراچی تک نہیں آسکتا تھا) سالہا سال حضرت قائداعظمؒ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر اور صوبہ مسلم لیگ کا صدر رہا' منزل گاہ اور دوسرے مقابلوں میں ہندوؤں کی زیادتیوں کا شکار رہا' دہلی پہنچ کر دعوت دے آیا تھا کہ بہار کے ستم رسیدہ مہاجرین کو سندھ میں بسایا جائے اور پاکستان کا دارالحکومت کراچی میں ہونا چاہیے۔ سندھ کے صوبائی خزانہ سے کئی کروڑ روپے صرف کر کے پاکستانی مہمانوں کی رہائش کے لیے کراچی میں نئے کوارٹرز تعمیر کروائے' سندھ کے تین کروڑ روپے نقد مرکز کے خزانہ میں جمع کروائے تاکہ مرکزی سرکار کو ہندوستان سے بروقت اس کے حصہ کی رقم نہ ملنے کی وجہ سے مرکزی ملازموں کی تنخواہیں تقسیم کرنے میں دقت نہ ہو' کئی لاکھ مہاجرین کو کراچی اور سندھ میں بسانے کا بندوبست کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

آئینی بلکہ جمہوری لحاظ سے بھی کھوڑو صاحب کی سندھ اسمبلی میں اس قدر مضبوط پوزیشن تھی کہ تقریباً سب ممبر سوائے دو چار ہندوؤں کے اس کے ساتھ تھے۔ وہ بلامقابلہ چیف منسٹر منتخب ہو چکا تھا۔

اس قدر مضبوط آدمی کو جس کی پچھلی اور حال کی خدمات اپنی جگہ پر بے انتہا درخشاں تھیں' ہٹانا آسان نہیں تھا' لہٰذا اس کو مرکز کی نظروں میں گرانے کے لیے خاص مہم کی ضرورت تھی۔

ابتدا کراچی کے مسئلے سے ہوئی۔ مرکز نے تقاضا کیا کہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے مرکزی انتظامیہ کے حوالے کر دیا جائے۔ اس بارے میں اخباری پروپیگنڈہ کچھ اس انداز سے شروع کرایا گیا۔ گویا سندھ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا جا رہا ہے اور اس جرم کی سزا کے طور پر اس کا مرکزی شہر اس سے چھینا جا رہا ہے۔ اس غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے سندھ کے عوام' خصوصاً طلبہ اور نوجوان طبقہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ سندھ اسمبلی نے بالاتفاق قرارداد پاس کر کے چیف منسٹر کو مینڈیٹ (MANDATE) دے دیا کہ

کراچی سندھ کا ہی حصہ رہنا چاہیے۔ کھوڑو نے مرکز سے تھوڑی سی مہلت مانگی تاکہ وہ پہلے صوبے کی رائے عامہ ہموار کر لے اور اخباری پروپیگنڈہ کی وجہ سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کر لے اور اس کے بعد مرکز کے حکم کی تعمیل کر دے۔ وہ تجربہ کار سیاستدان تھا اور لوگوں کی نفسیات اور جمہوری طریقے سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں یہ طریقہ بہتر تھا کہ لوگوں کے دلوں سے پہلے غلط فہمیاں دور کر کے ان کی رضا سے ہی یہ سارا کام کر دیا جائے تاکہ ان کے دلوں میں احساس محرومی و مظلومی ایک مستقل روگ بن کر نہ رہ جائے۔ اس کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ مسئلہ کہیں آگے چل کر نئی اور پرانی آبادی کے باہمی تعلقات پر اثرانداز ہونے کا باعث نہ بن جائے۔

اب تک معاملہ کو بگاڑا محض غلط پروپیگنڈے نے تھا اور اس کو سلجھانے کے لیے کھوڑو کو تھوڑے سے ٹائم کی ضرورت تھی جو نہیں دیا گیا۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ نوکرشاہی کے کون کون لوگ اُس وقت پس پردہ کوشاں تھے کہ کھوڑو کو قطعاً مہلت نہ دی جائے اور اس کو فوراً مرکز سے لڑا کر مستقلاً سیاست سے ہٹانے کا بندوبست کر دیا جائے۔ (میں ان دنوں سندھ آبزرور کا ایڈیٹر تھا اور درون خانہ ریشہ دوانیوں سے باخبر رہتا تھا میرا اپنا مؤقف' جس کا اظہار میں کھل کر آبزرور میں کرتا رہا' یہ تھا کہ کراچی کو بلاتاخیر مرکز کے حوالے کر دینا چاہیے کیونکہ آگے چل کر یہ منتقلی عارضی ثابت ہو گی اور جیسے ہی فوری مسائل حل ہو جائیں گے قانون ثقل کی کارفرمائی سے مرکز کو کوئی زیادہ مستحق صوبہ اٹھا کر اپنے یہاں لے جائے گا اور کراچی واپس سندھ میں آ جائے گا۔)

بہرنوع اُس وقت کھوڑو کو ٹائم نہیں دیا گیا اور اس کو گورنر کے ذریعے (جمہوری طریقہ سے سندھ اسمبلی سے پوچھے بغیر) ڈسمس کروا کر اس کے خلاف ٹریبونل بٹھا دیا گیا۔ الزامات بدعنوانی کے لگائے گئے اور پہلی بار نوکرشاہی کے آدمی بالادست وزیراعلیٰ کے خلاف بطور عدالتی گواہ بیانات داغنے لگے اور ایک نئی رسم کی ابتدا ہو گئی۔

ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ حضرت قائداعظمؒ کا انتقال ہو گیا اور جس طرح میں پچھلے مضامین میں عرض کر چکا ہوں یکایک ایک نیا قانون بنام "پروڈا" نافذ ہو گیا۔

ٹریبونل نے اکثر الزامات رد کر کے محض چند ایک معمولی انتظامی بدعنوانیوں کے سلسلے میں کھوڑو کو مجرم قرار دیا۔ مرکز نے اس سفارش کو بنیاد بنا کر "نئے قانون" پروڈا کے تحت کھوڑو کو دو سال کے لیے سیاست سے خارج کر دیا (پروڈا کا یہ پہلا شکار تھا)۔

مگر ہائیکورٹ نے اپیل پر کھوڑو کو بے قصور قرار دے کر پروڈا کی کارروائی منسوخ کر دی۔ جان بچی تو لاکھوں پائے!

مگر کھوڑو غریب کی جان پھر بھی نہیں بچی۔

انہی دنوں کھوڑو کے خلاف دو فوجداری مقدمے بھی بن چکے تھے۔ ایک یہ کہ: "ایک ہندو کی چھوڑی ہوئی موٹر سائیکل سندھ کے چیف منسٹر کے بنگلے سے دستیاب ہوئی تھی' یہ ہندو بھارت چلا گیا تھا۔ دوسرا مقدمہ اس نوعیت کا تھا کہ سرکاری چھاپہ خانہ کی ایک کنڈم چھوٹی ٹریڈل مشین کھوڑو نے عام نیلام میں سستے داموں اپنے پریس کو دلوائی تھی۔

دونوں مقدمے باہر سے آئے ہوئے ایک ریٹائرڈ افسر (جس کو ان مقدمات کی سماعت کے لیے اسپیشل مجسٹریٹ کے اختیارات سونپے گئے) کی عدالت میں چلے۔ وہاں سے تو جیل اور جرمانے کی سزا ہو گئی مگر ہائیکورٹ نے اپیل میں دونوں مقدمات کو جھوٹا قرار دے کر کھوڑو کو باعزت بری کر دیا۔

کھوڑو اس وقت تو ہائیکورٹ کے فیصلوں کے زیر سایہ دوبارہ سندھ کے وزیر اعلیٰ منتخب ہو گئے مگر وہ ابھی مشکل سے کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ پھر ان کے خلاف پروڈا کے تحت ایک نیا مقدمہ بنایا گیا اور ان کو چند سال کے لیے سیاست کے لیے نااہل قرار دے کر نکال دیا گیا۔

ابھی یہ نااہلی کا عرصہ چل ہی رہا تھا کہ خود پروڈا کے متعلق انکشاف ہوا کہ یہ قانون سرے سے خلاف آئین بنا تھا۔ اس لیے اس کو منسوخ اور اس کے مجروحین کو معصوم سمجھا جائے۔ اب کھوڑو تیسری مرتبہ سندھ کا چیف منسٹر بنا اور ون یونٹ بن جانے کے بعد بھی وزارت سے منسلک رہا۔ حتیٰ کہ نوکر شاہی نے مسلم لیگ پارٹی کے پیٹ کا آپریشن کروا کر اس میں سے نئی ری پبلکن پارٹی کا بچہ برآمد کیا۔ کھوڑو سے یہ

بات برداشت نہ ہو سکی اور وہ مسلم لیگ کے ایشو پر استعفیٰ دے کر وزارت سے نکل آیا۔

اسکندر مرزا مرحوم کے آخری ایام میں کھوڑو مرکز کا وزیر دفاع بنا۔ ایوب خان مرحوم ریٹائر ہونے والے تھے مگر کھوڑو ان کی میعاد ملازمت میں دو سال کی توسیع کر کے خود اپنے اوپر آفت لے آیا۔

ابھی ایوب خان مرحوم کی تشریف آوری کو مشکل سے دو دن ہوئے تھے کہ اس وقت کے وزیر دفاع (کھوڑو صاحب) گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیئے گئے۔ مقدمہ بنا کہ انہوں نے اپنی ذاتی موٹر کار کی فروخت سے منافع کمایا تھا۔ ابتدائی عدالت سے جیل کی سزا ہو گئی اور ان کو غالباً زنجیر پہنا کر سی کلاس میں ڈال دیا گیا۔

اپیل میں مقدمہ کو جھوٹا اور کھوڑو کو بے قصور قرار دے دیا گیا۔

مگر کھوڑو اپنی روایتی سخت جانی کے باوجود اب ہمت ہار چکا تھا۔ اپنی خدمات اور عمر بھر کی قربانیوں اور مشقتوں کا یہ صلہ پا کر اس ملک کی سیاست سے کنارہ کش ہو کر گھر میں بیٹھ گیا۔ بیس سال زندہ رہا' سیاست کے قریب نہ آیا۔

نوکر شاہی کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ کھوڑو کو بالآخر سیاست سے نکال کر ہی دم لیا حالانکہ بہ حیثیت **ADMINISTRATOR** وہ ایک لاثانی جینیس **GENIUS** تھا' جس کی انتظامی صلاحیتوں سے پاکستان کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا گیا۔

ملک کے سیاسی دماغوں کو کچلا گیا

قوم کے سیاسی ٹیلنٹ TALENT کو کچلنے اور پاکستان کی خدمت سے دور رکھنے کے لیے بالواسطہ و بلاواسطہ جو کچھ نوکر شاہی کرتی رہی اُس کی ایک مثال کھوڑو مرحوم کی کہانی کی صورت میں پچھلے ہفتے پیش کر چکا ہوں' اس ہفتہ کچھ مزید مثالیں عرض کر رہا ہوں۔ یاد رہے کہ یہ ساری حرکتیں نوکر شاہی کے اس بڑے منصوبے کا ایک حصہ تھیں جس کا مقصد تھا کہ پاکستان میں جمہوریت کو فیل کیا جائے' عوام کو ان کے انسانی اور جمہوری حقوق سے محروم رکھا جائے اور اس طرح سے نوکر شاہی کو موقع دیا جائے کہ وہ سیاسی پاور اپنے ہاتھوں میں لے کر لوٹ مار کرے' نئی کالونیاں بنائے' بینک بیلنس بڑھائے اور پاکستان کو اپنے طبقہ کی ترقی و بہبود کے لیے "ہذا من فضلِ ربی" کی تصویر بنالے۔

شیخ عبدالمجید سندھی مرحوم ایک آسودہ حال ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ سن شعور کو پہنچتے ہی مسلمان ہو گیا۔ اور ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتا رہا اور انگریز اور ہندو دونوں کے ہاتھوں مصیبتیں جھیلتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اِس شخص میں اتنی صلاحیتیں رکھی تھیں کہ اُن کے پیش نظر ہندوستان کے مسلمانوں نے اِس کو آل انڈیا خلافت کمیٹی کا صدر منتخب کیا اور مولانا شوکت علی مرحوم جیسی شخصیت نے اِس کے تحت سیکرٹری رہ کر کام کرنا اپنے لیے باعث افتخار سمجھا۔ خلافت کانفرنس اجمیر کے سامنے جو خطبۂ صدارت اِس نے پڑھا' اُس

کو مسلمانوں کی تحریک آزادی سے متعلق جملہ عظیم دستاویزات میں سے ایک سمجھا گیا اور اس کی وجہ سے دنیا بھر کے سیاسی حلقوں میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔

آل انڈیا سیاست میں شیخ صاحب مرحوم آل پارٹیز کانفرنس کا صدر بھی بنا' جہاں ہندوستان بھر کی جملہ قوموں اور فرقوں کے چوٹی کے لیڈروں نے اِس کی دماغی صلاحیتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

سندھ کی صوبائی سیاست میں وہ بمبئی کونسل اور بعد میں سندھ اسمبلی کا ممبر اور وزیر رہا۔ ویسے وہ زندگی بھر صحافت سے وابستہ رہا اور کئی سال سندھ کے واحد مسلم روزنامہ الوحید کو ایڈیٹ کرتا رہا۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کروانے کے لیے جو تحریک چلی اس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

مسلم لیگ سے شیخ مرحوم کا لگاؤ ازلی اور ابدی تھا۔ قائداعظمؒ کی ورکنگ کمیٹی کا وہ اس زمانہ میں ممبر بنا' جب کوئی اور سندھی لیڈر لیگ کی گلی میں قدم رکھنے تک تیار نہیں تھا۔

1938ء والی کراچی مسلم لیگ کانفرنس میں شیخ مرحوم نے ہی وہ تاریخی قرارداد پیش کی جس نے تقریباً دو سال بعد تحریک تقسیم برصغیر و قیام پاکستان کی بنیاد ڈالی مگر پاکستان بن جانے کے بعد اس شخص کو سیاسی اچھوت قرار دے کر اس لیے پس منظر میں پھینک دیا گیا کہ اس پایہ کے تجربہ کار جہاں دیدہ اور بااصول آل انڈیا کڑی کے لیڈر کو نوکر شاہی کا چمچہ نہیں بنایا جا سکتا تھا اور اس کا سیاسی کردار اس قدر پاک اور صاف تھا کہ اس کے سیاست میں رہنے کے بعد جمہوری سیاست کو بدنام کرنے کے مواقع کم ہو جاتے۔

نہ صرف یہ کہ شیخ صاحب مرحوم کو پاکستان کی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ جیسے ہی نوکر شاہی کے تعاون سے ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا' جبکہ شیخ کی عمر 85 سال کی تھی تو اس کو اس گناہ کی پاداش میں جیل میں ڈال دیا گیا کہ اس نے ایک کاغذی عرضداشت PETITION OF RIGHTS بصورت قرارداد مرتب کی تھی جس کا مفہوم یہ تھا:

"اے سلطان ابن سلطان فی الحال شہنشاہ پاکستان جنرل ایوب خان' فیلڈ

مارشل (بغیر کوئی جنگ لڑے) زمیں وزماں' خالق شوشہ بنیادی جمہوریاں' اللہ تعالیٰ آپ کو فتح پاکستان اور اس پر آپ کا شخصی راج مبارک کرے کیونکہ شروع میں یہ ملک آپ ہی نے اپنی تلوار آبدار سے انگریز اور ہندو دونوں کو میدان جنگ میں شکست دے کر حاصل فرمایا تھا۔ (جب سیاست دان اور ہندوستان کے مسلمان ووٹر محض بکواس کرتے پھرتے تھے)

"اس وقت ہم سوختہ سامان' بندگان درگاہ' بندوق پائیگاہ کی التجا صرف اتنی ہے کہ پاکستان میں بسنے اور سانس لینے والے ان بے زبان' انسان نما کیڑوں مکوڑوں کو (جن کو عرف عام میں عوام کہا جاتا ہے) ان کے پیدائشی جمہوری اور انسانی حقوق سے مزید وقت محروم نہ رکھا جائے اور شعبدہ بازیوں اور جھوٹی زبانی طفل تسلیوں کو چھوڑ کر' ان کی طرف' انسانی جمہوری حقوق کا ٹکڑا پھینک کر' ان کو اقوام عالم کے سامنے مستقلاً بے آبرو ہو کر رہنے سے بچالیا جائے۔"

اس بچاسی سال کے بوڑھے بیمار کی تب جا کر ایوبی عتاب سے جان چھوٹی جب اللہ تعالیٰ نے خود ایوب خان کو ہٹانے کا انتظام فرمایا (عوام کو حقوق پھر بھی نہیں ملے' صرف اتنا ہوا کہ ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان آ گیا یعنی یک نہ شد دو شد)۔

غازی محمد بن قاسم رحمتہ اللہ علیہ کا ایک مشہور شعر ہے جو فتح سندھ کے بعد جب ان کو بطور انعام واسط کی جیل میں بند کر دیا گیا' انہوں نے لکھا تھا:

"جس سپاہی کا امتحان میدان جنگ میں ہونا چاہیے تھا...... اس کا امتحان اب واسط کے قید خانہ میں ہو رہا ہے!"

یہ شعر شیخ سندھی کے حال پر صادق آتا تھا' جس شخص کی بے شمار صلاحیتوں کا امتحان کسی بین الاقوامی اسٹیج پر ہونا چاہیے تھا' وہ اس کو یہاں کی جیلوں میں رکھ کر جلایا گیا۔

غضب تو یہ ہوا کہ جب اسکندر مرزا مرحوم مرکز کے سیکرٹری انٹریئر بنا تو اس نے اپنے حکم سے شیخ صاحب کا اخبار "الوحید" بھی بند کر دیا۔ یہ الوحید سندھ کے مسلمانوں کا اکیلا روزنامہ تھا۔ چھتیس سال ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے کاز کے لیے لڑتا رہا تھا اور پچھلے سولہ سال تو وہ تحریک پاکستان کا باقاعدہ آرگن رہ چکا تھا۔

محمد ہاشم گزدر مرحوم سے بڑا قائداعظمؒ کا جاں نثار سپاہی تصور میں آنا مشکل تھا۔

ویسے تو جب پاکستان بن گیا اور قائدؒ کا انتقال بھی ہو گیا تو بہت سارے ان کے "دست راست" نظر آنے لگے۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی دیکھے گئے جن کی اپنی پیدائش تو قائدؒ کے انتقال کے بعد کی تھی مگر پھر بھی انہوں نے دست راست ہونے کے دعوے داغ رکھے تھے۔ گویا یہ حضرات ماں کے پیٹ میں ہی قائدؒ کے دست راست کے طور پر کچھ قومی کام کرتے رہے تھے۔

اللہ کی قدرت سے تو یہ بات بھی بعید نہیں تھی مگر نظر بظاہر ایسے دعوؤں کا جوڑ ملتا نہیں۔

بہرحال گزدر اس قسم کے مدعیوں میں سے نہیں تھے' ان کی پاکستانی کاز سے وابستگی' قائدؒ سے عقیدت اور پچاس سالہ خدمات اظہر من الشمس تھیں' مہد تا لحد مجاہد رہے' اسمبلیوں کے ممبر رہے' وزیر بنے' کراچی کے میئر منتخب ہوئے' پاکستان کے آئین ساز اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بنے۔ اُن کی خدمات کی فہرست اِس قدر طویل ہے کہ اِس مضمون میں اِس کے لیے گنجائش پیدا نہیں کی جا سکتی۔

مگر اِس شخص کا خلوص اور اِس کی سیاسی صلاحیت ہی قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد' اِس کی تباہی کا باعث بنی۔ وہ شروع سے ہی نوکر شاہی کی بلیک لسٹ پر رہا۔ صرف موقع کا انتظار ہی موجب تاخیر تھا۔ قائدین کی رحلت کے بعد جب گورنر جنرل غلام محمد مرحوم نے آدھی رات کے وقت بوگرہ مرحوم کو پستول دکھا کر آئین ساز اسمبلی تڑوائی تو گزدر اِس کا ڈپٹی اسپیکر تھا۔ مولوی تمیزالدین خان مرحوم کے استغاثہ پر جو مقدمہ چلا اِس میں گزدر نے نوکر شاہی کی جمہوریت کش سازشوں اور آئین سوز کارگزاریوں کی پردہ دری میں کلیدی کردار ادا کیا۔

یہ بات نوکر شاہی کی نظروں میں کھٹکتی رہتی تھی' جیسے ہی ایوب خان مرحوم نے نوکر شاہی سے مل کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تو اِس سے اِس بارے میں کام لیا گیا۔ پہلے گزدر کو جیل میں ڈلوایا گیا۔ پھر اس کو اِس امید پر چند دن کے لیے جیل سے رہا کیا گیا کہ وہ ایوب خان کی بوگس مسلم لیگ کے لیے کراچی میں کام کرے گا' مگر جب

گزدر نے اِس جعلسازی میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا تو دوبارہ اِس کو سینٹرل جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ وہاں پڑا اب تک کراہتا رہا جب تک اس پر دل کا دورہ نہیں پڑا۔ مجبوراً اِس کو جیل سے رہا کیا گیا مگر باہر آتے ہی چند دن کے اندر دہی دل کی بیماری اس کو قبر میں لے گئی۔

تمیزالدین خان والے مقدمے کے بارے میں آپ جناب جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب کا حال ہی کا بیان پڑھ چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مقدمہ فیصل کرنے والے سپریم کورٹ کے چیف مرحوم منیر نے ایک محفل کے سامنے خود اظہار یا اقرار کیا تھا کہ تمیز الدین خان کے مقدمے میں انہوں نے جو فیصلہ دیا تھا' وہ ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ جسٹس تنزیل کے مزید ارشادات اِس بارے میں جو ڈان 21 اپریل 1982ء میں شائع ہو چکے ہیں' خاص طور سے قابل ملاحظہ ہیں۔

سندھ کے سیاستدانوں پر جو افتاد آئی اس سے مرحوم میر غلام علی خان' جناب قاضی فضل اللہ صاحب' پیر الٰہی بخش مرحوم' قاضی محمد اکبر جیسے نرم مزاج سیاست کار بھی بچ کر نہیں نکل سکے۔ بارہا اُن کو ڈبویا گیا' پھر اٹھایا گیا' پھر ڈبویا گیا' تا وقتیکہ ان میں سیاست کی سطح پر مزید تیرنے کی سکت نہیں رہی۔ میر صاحب اور قاضی صاحب پروڈا کا شکار ہو گئے۔ پیر الٰہی بخش مرحوم اور قاضی محمد اکبر مرحوم جی ایم سید کے خلاف اور مسلم لیگی امیدوار کی حمایت میں الیکشن میں کام کرتے وقت بعض بدعنوانیوں کے مرتکب پائے گئے اور سیاست سے خارج کر دیئے گئے۔ انہوں نے الیکشن میں مسلم لیگ کے حکم پر حصہ لیا تھا مگر جب ان پر قانونی گرفت ہوئی تو ان کو بچانے کے لیے کوئی ترکیب نہیں کی گئی۔ ع

"مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے"

اگر کھوڑو مرحوم اِس لیے زیر عتاب آیا کہ وہ کراچی مرکز کو نہیں دے رہا تھا تو پیر صاحب کو جس نے کراچی دے دیا' کیا انعام ملا؟ کیوں اُس کا حشر بھی وہی ہوا جو کھوڑو کا ہوا؟ اگر خلاف آئین پروڈا اِس کیا جا سکتا تھا تو پیر الٰہی بخش مرحوم کو بچانے کے لیے اتنی جرأت کیوں نہیں دکھائی گئی؟ یہاں تو محض الیکشن رولز میں معمولی ترمیم کرنے کی ضرورت تھی اور پیر مرحوم بچ جاتا۔ (یہ تھا موقف پیر الٰہی بخش مرحوم کا اپنا) مگر

ہوا یہ کہ کراچی نہ دینے والے اور دینے والے کا حشر ایک ہی ہوا جس کے معنی یہ ہوئے کہ چونکہ اصل مقصد جھاڑو ہی پھرانا تھا تو دوست دشمن میں تمیز نہیں کی گئی۔

میں جی ایم سید کا وکیل یا طرفدار نہیں' بارہا اُن سے میرے شدید اختلافات رہے گو کہ سندھ کی سیاست میں ہمعصر رہے مگر یہ نہیں ہوا کہ ہم سارا وقت ہمسفر بھی رہے 'اُن کا راستہ اپنا تھا' میرا اپنا۔

نہ ہی اب سید صاحب کو کسی وکیل کی ضرورت ہو گی۔ اسی سال کے بوڑھے دائم المریض' مجموعی طور پر سترہ سال سے نظر بند 'انسان کے دل میں کیا تمنا رہ گئی ہو گی جس کی خاطر وہ یہ پاپڑ بیلتا پھرے؟ میری نظر میں اب اِس کا معاملہ مستقبل بعید کے مؤرخ کے حوالے رہے گا جو یہ فیصلہ کرے گا کہ جو کچھ ہوا اس سے کون فائدہ میں رہا' اور کون نقصان میں۔

چند باتیں البتہ جو میرے علم میں ہیں اُن کے بارے میں ریکارڈ پر اب بھی لائی جا سکتی ہیں۔

مثلاً:-

پہلی بات یہ ہے کہ سید صاحب پہلے پیدائشی عاق نہیں تھے۔ مسلم لیگ کے ابھرنے سے پہلے کے دور میں وہ ان دوچار ترقی پسند اور عوام دوست مسلمان نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے سندھ کو بمبئی کے ہندوزدہ صوبے سے علیحدہ کروایا اور علیحدگی کے بعد صوبائی حکومت پر انتہائی ذاتی دباؤ ڈال کر اس سے پرانی مستبد اور ہندوؤں سے متاثر 'نوکر شاہی کے پاؤں اکھڑوا دیئے۔ نوکر شاہی سے کبھی اِس کی نہیں بنی۔ انگریز کا وہ سخت ترین دشمن رہا۔ رشوت خوری کے خلاف اِس کا جہاد چالیس سال چلا۔ ہو سکتا ہے کہ اِس کی اُن خصوصیتوں اور کارناموں نے اِس کو بعد کی نوکر شاہی کی نظروں میں معتوب کیے رکھا ہو کیونکہ ایسے شخص کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ نئی نوکر شاہی کا کار آمد چمچہ بن سکے گا۔

مسلم لیگ کی تحریک شروع ہوئی تو یہ شخص قائداعظمؒ کا سرفروش سپاہی اور تحریک پاکستان میں صف اوّل کا کارکن بن گیا۔ سالہا سال قائدؒ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر اور آل انڈیا مجلس عمل کا انتہائی نازک اور فیصلہ کن دور میں 'معتمد ترین رکن رہا۔ قائداعظمؒ

پر قاتلانہ حملہ ہوا تو خبر سنتے ہی اسمبلی اجلاس میں بیہوش ہو کر گر پڑا اور تاوقتیکہ قائدؒ صحت یاب نہیں ہوئے یہ بندۂ خدا ہر نماز کے بعد رو رو کر اللہ تعالیٰ سے التجائیں کرتا رہا کہ اِس کی بقیہ عمر قائد کو دے کر اِس کو اُن پر قربان ہونے کا موقع دیا جائے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے کراچی والے سالانہ اجلاس 1942ء کے سامنے جو خطبہ اِس نے بہ حیثیت چیئرمین استقبالیہ کمیٹی پڑھا وہ پاکستان کے مضمون پر اِس پایہ کی چیز تھی کہ خود اِس کے دشمن اب بھی بار بار اخبارات میں چھاپتے رہتے ہیں گو کہ پڑھنے والوں کو مغالطہ میں رکھنے کی نیت سے وہ سید کا نام صحیح طور پر نہیں لکھتے (غلام مرتضیٰ شاہ لکھ دیتے ہیں جس نام سے وہ مشہور نہیں۔ "جی ایم سید" لکھنے سے گھبراتے ہیں) سندھ میں مسلم لیگ کی تنظیم اِس کے ذریعے ہی ممکن ہو سکی۔

پھر سندھ اسمبلی ہندوستان بھر میں پہلا قانون ساز ادارہ تھا، جس نے اِسی جی ایم سید کی تحریک پر اِس وقت پاکستان کے مطالبہ کی حمایت میں قرارداد پاس کی جبکہ پاکستان کا صرف نام لینا ہی انگریز اور ہندو کی نظر میں گناہ سمجھا جاتا تھا۔

منزل گاہ والی مسلم لیگی تحریک سید ہی نے چلوائی۔ ایک مدت خود جیل میں رہا۔ یہ اِس کی ان کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ سندھ کے مسلمان ہمیشہ کے لیے کانگریس اور ہندوؤں کے چکر سے نکل کر من حیث القوم مسلم لیگ کے پرچم کے تحت جمع ہو گئے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اِس قسم کے سرفروش مسلم لیگی اور پاکستانی سے کون سا سہو ہوا جس کی وجہ سے وہ زیرِ عتاب آگیا اور اِس کی اگلی پچھلی خدمات ڈھل گئیں؟

جہاں تک مجھے معلوم ہے سید سے سہو یہ ہوا کہ اس نے سندھ کی چار پانچ اسمبلی سیٹوں کے بارے میں مرکزی پارلیمانی بورڈ (جو دور سے آئے ہوئے بزرگوں پر مشتمل تھا) کا فیصلہ نہیں مانا۔ فیصلہ نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ پارلیمانی بورڈ نے صوبائی سندھ مسلم لیگ کے خلاف یہ ٹکٹ سندھ کے چند شہرۂ آفاق راشیوں اور بدنام موقع پرستوں میں تقسیم کیے جن کے پنجہ سے صوبہ کے غریب مسلمان عوام کی جان چھڑانے کے لیے پورے بیس سال سندھ کی نئی نسل جدوجہد کرتی رہی تھی۔ یہی لوگ تھے جو کانگریس اور ہندوؤں سے مل کر سندھ کے عوام کو مدتوں سے لوٹتے رہے

تھے، جن کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لیے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کروایا گیا تھا، جن کی کانگریس کی خدمت گزاریوں سے بچنے کے لیے سندھ کی نئی قیادت نے مسلم لیگ میں پناہ لی تھی، جن کی ہندو نوازیوں کی وجہ سے مسجد منزل گاہ کا مسئلہ الجھ گیا تھا اور سید والوں کو منزل گاہ تحریک چلانی پڑی تھی، جس کے دوران سید سمیت پندرہ سو مسلمان جیلوں کی ہوا کھاتے رہے تھے، کئی سو مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور کچھ انگریز کے ہاتھوں تختہ دار پر بھی چڑھ گئے تھے۔

(ضمناً یاد رہے کہ اِس وقت کی ہاہمی میں وہ چند ٹکٹ یافتہ جھوٹے لیگی منتخب تو ہو گئے تھے مگر آگے چل کر سندھ کے مسلمانوں میں اس کے ردعمل کا سارا نزلہ مسلم لیگ کی جان پر گرا اور بطور فعال جماعت وہ پھر کبھی سنبھل نہیں سکی اور سیاسی لحاظ سے محض چند پرانے مجاوروں کی محفل بن کر رہ گئی۔)

میں مانتا ہوں کہ جی ایم سید کو اِن حالات کے باوجود پارلیمانی بورڈ کا فیصلہ قبول کر لینا چاہیے تھا مگر اُس سے یہ نہیں ہو سکا اور اُس نے "غداری" کی صلیب اپنے کاندھے پر رکھ لی۔ کسی نے اُس کی عمر بھر کی خدمت، اُس کی قربانیوں، اُس کی اذیت کوشیوں اور اُس کے بعد کے وقتی سہو کو ترازو میں ڈال کر یہ دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ کون سا پلڑا بھاری تھا۔ افسوس ہے کہ اُس واقعہ کے دو سال بعد قائداعظمؒ خود انتقال کر گئے۔ ورنہ کوئی سبب نہیں تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ سید کے سہو پر نظرثانی فرما کر اُس کو دوبارہ پاکستان کی خدمت کا موقع نہ دیتے، جس طرح وہ قیوم خان مرحوم کے بارے میں کر چکے تھے یا بعد میں مولوی فضل الحق مرحوم کے بارے میں ہوا۔ قائدؒ کے بعد تو غدار سازی کی انڈسٹری باقاعدہ چل پڑی۔ اس میں سید جیسے نوکر شاہی کے روایتی دشمن کے معاملہ پر کون ہمدردانہ غور کرتا یا نظرثانی کرتا؟ جس پھوڑے کا فوری علاج ہو سکتا تھا وہ اب ناسور بن کر رہ گیا تھا۔

تیسری بات اصولی ہے اور یہ ہے:

رومیوں کے سب سے بڑے سپہ سالار جولیس سیزر کا قول ہے کہ اگر آپ اپنے صحن میں شیر رکھیں تو پہلے اس کی عادات اور طبعی خصوصیات جان لیں، یعنی اپنی فوج کے ہر افسر کی مزاجی ساخت و صلاحیت کو سامنے رکھ کر اِس سے سلوک کیا جائے

اور اِس سے کام لیا جائے، تبھی تو بڑے محاذ فتح کیے جا سکتے ہیں اور ملک چلائے جا سکتے ہیں۔

سید کی مزاجی ساخت کو پہچاننے کی شاید کسی نے کوشش نہیں کی۔

میں نے اِس کو قطعاً غیر معمولی انسان پایا۔ اِس طبیعت کا دوسرا آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ جذباتیت میں یگانہ، خودداری میں عجوبۂ روزگار اور غالب کے اِس شعر کا مکمل مصداق:

تشنہ لب بر ساحلِ دریا زغیرت جان دہم
گر بموج افتد گمان چیں پیشانی مرا

صحیح یا غلط جو بات ذہن میں آ جائے اس کی خاطر جان گنوا دینے اور گھر بار لٹا دینے والا یہ شخص بعد کی موڈرن سیاست کے لیے قطعاً غیر موزوں تھا، یعنی چمچہ بننا تو درکنار باورچی خانہ کی بو سے بھاگ جانے والا انسان تھا، مگر کیا کیا جاتا؟ قدرت نے اِس کو بنایا ہی ایسا تھا۔ ع

باہمیں مرد ماں بہ باید ساخت

ہیرے کی کنی ایک سخت چیز ہوتی ہے وہ زہر کے طور پر تو استعمال ہوتی ہی ہے مگر اِس سے فولاد اور دوسری سخت سے سخت چیزوں کو کاٹنے کا کام بھی لیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی قیمت ہر چیز سے زیادہ ہوتی ہے۔ مدار اِس بات پر رہتا ہے کہ یہ کنی کون استعمال کر رہا ہے اور کس کے قبضہ میں ہے؟ اِس شخص کو اس چیز کی پہچان بھی ہے یا نہیں؟ اِس کے استعمال کے طریقے جانتا بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہیرے کی کنی کو صرف اِس کی اہمیت کی وجہ سے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں دفن کر دیا جائے اور اِس کے فوائد والے پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو بتایئے کیا یہ عقلمندی کا کام ہوگا؟ قومی کاروبار میں بھی ہر سپاہی کی افتادِ طبیعت کو سامنے رکھ کر ہی اس کو تعمیری کام میں لگایا جاتا ہے یعنی اس کی وقتی کمزوریوں سے مصلحتاً قطع نظر اِس کی غیر معمولی اچھائیوں اور صلاحیتوں کے پہلو کو ابھرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور اِن سے غیر معمولی کام لیئے جا سکتے ہیں۔ فوج کا سپاہی اگر اتفاقیہ گھوڑے پر سے گر جاتا ہے تو اِس کو روندا نہیں جاتا بلکہ اٹھا کر پھر گھوڑے پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں مگر غالباً یہ حضرت حکیم الامتؒ

کا ہی فرمودہ ہے کہ:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

چرچل کو ڈارڈنلز پر خفا ہو کر اِس کی قوم نے سالہا سال تک گالی گلوچ کا نشانہ بنائے رکھا مگر اسی چرچل نے آگے چل کر اِس قوم کو ہٹلر کی غلامی سے بچا لیا۔ اگر یہ چرچل نہ ہوتا تو آج برطانیہ کا کیا حال ہوتا؟ سیاست میں کوئی چیز مستقل نہیں ہوتی اور مستقل روگ نہیں سمجھی جاتی۔

ہمارے اپنے ہادی اور رہبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں کتنی مثالیں ملتی ہیں کہ آپؐ نے اپنے حسنِ سلوک اور وسیع القلبی سے کئی ایک گرتوں کو تھام کر ان سے دین اللہ کے فروغ کے لیے بڑے بڑے کام لیے اور معرکے جتوائے۔

ہمارے قائداعظمؒ نے سب سے زیادہ درشت الفاظ مولوی فضل الحق کے بارے میں استعمال فرمائے تھے۔ پھر اسی فضل الحق کو مجموعی قومی مفاد کی خاطر کیوں گلے سے لگایا؟ کیوں مرکزی وزیر داخلہ بنایا گیا؟ کیوں مشرقی پاکستان کی گورنری اِس کے حوالے کی گئی؟ مرحوم خان قیوم نے کسی زمانہ میں اپنی کتاب "گولڈ اینڈ گن" میں کیا کچھ قائد کے خلاف نہیں لکھا تھا؟ پھر اسی قیوم خان کو کیوں سرحد کا لیگی چیف منسٹر اور بارہا مرکزی وزیر بنایا گیا؟

اور آخری بات۔

قومی امور میں اگر مطمحِ نظر قوم کی مجموعی بھلائی ہو...... اگر للّٰہیت یعنی الحب للہ والبغض للہ سے ذاتی سیاست یا انا کا ٹکراؤ نہ ہو...... اگر سیاست کی بنیاد محض تعصب، ذاتی عناد، انتقام، تنگدلی یا کم ظرفی پر نہ ہو...... اگر کسی کا جرم ضعیفی ناقابلِ عفو نہ ہو...... تو ہر چیز پر نظرثانی ہو سکتی ہے اور بشریت کی وقتی کمزوریوں پر انسان کی خوبی کو حاوی ہونے کا موقع دیا جا سکتا ہے۔ اچھا باورچی اندرائن (حنظل) جیسی تلخ ترین چیز کو بھی مربے میں تبدیل کر سکتا ہے۔ کریلے جیسی کڑوی سبزی کا مربہ مشہور ہے۔ شرط یہ ہے کہ باورچی یہ فن جانتا ہو اور اس کی نیت بخیر ہو۔

انسانی کاروبار میں جو کام دل نوازی سے نکل سکتا ہے، انسان اگر صرف پرانی

شخصی یا گروہی کدورتوں کی کڑاہی میں سارا وقت جلتا بھنتا رہے تو اس کی سوچ کی صحت کسی صورت میں بحال نہیں رہ سکتی اور اس کا عمل عظیم ملکی مفاد کے منافی ہوگا۔

ایک پرانا صوفی کیا خوب کہہ گیا ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ......

کہ در گہہ مادر گہہ نا امیدی نیست

اگلے ہفتے بشرط زندگی، مرحوم و مغفور شہید ملتؒ کی شہادت والے واقعہ کے بارے میں جو کچھ میرے علم میں آسکا ہے وہ عرض کردوں گا۔ یہ بھی دکھاؤں گا کہ ان کی شہادت کے واقع ہوتے ہی کس طرح نوکر شاہی براہِ راست سیاست میں گھس آئی اور نوکر شاہی کے کس آدمی نے کیا ترقی کی اور کون سا سیاسی عہدہ مار لیا۔

قائد ملت کی شہادت اور نوکر شاہی کے لیے من و سلویٰ کا نزول

قائد ملتؒ کی شہادت 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں واقع ہوئی۔ جمہوریت کا چراغ اُس دن بجھ گیا اور نوکر شاہی کے لیے آگے بڑھنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کا راستہ کھل گیا۔

خود شہادت والے واقعہ کی نوعیت یہ تھی۔

قائد ملتؒ 16 اکتوبر کی صبح راولپنڈی پہنچے۔ اُن کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ بقول بیگم رعنا لیاقت علی خان، جن کا انٹرویو حال ہی میں ایک مقامی اخبار میں چھپ چکا ہے۔ شہید ملت کو اِس جلسہ عام کے سامنے نئے عام انتخابات کا اعلان کرنا تھا۔ (اگر اس روز یہ اعلان ہو جاتا اور انتخابات ہو جاتے تو تاریخ بدل جاتی اور نوکر شاہی کے سیاسی عزائم خاک میں مل جاتے کیونکہ انتخابات سے نظام جمہوریت میں از سرِ نو توانائی پیدا ہو جاتی۔)

مگر ہوا یوں کہ اِس جلسہ عام میں جیسے ہی قائد ملت تقریر کرنے کے لیے اٹھے اور ابھی دو الفاظ ''برادرانِ اسلام'' ہی بولے تھے کہ دو گولیاں چل گئیں۔ ایک اُن کے سینہ میں پیوست ہو گئی اور دوسری نے اُن کے قاتل کو ڈھیر کر دیا یعنی موقع پر ہی بانس کے کٹ جانے سے بانسری کے بجنے کا خطرہ نہیں رہا۔

قتل کی تفتیش کا کام مرکز کے ایک پولیس افسر کے سپرد ہوا۔ وہ بدقسمت افسر کچھ دستاویزات لیے ابھی کراچی آ رہا تھا کہ اِس کا ہوائی جہاز کراچی پہنچنے سے چند منٹ پہلے راستے میں گر کر تباہ ہو گیا۔ افسر مر گیا تفتیش کے کاغذ جل گئے! آن دفتر سے راگاؤ

خورد' گاؤ را قصاب برد' قصاب ہم مرد!

شہید کی بیوہ کے بین نے طوالت پکڑی تو اِس کو سفارت دے کر ملک سے ہی باہر بھیج دیا گیا۔

یہ خونیں ڈرامہ اگر امریکہ جیسے ملک میں ہوتا تو اِس پر کم از کم کئی ایک ڈیکٹیو فلمیں بن جاتیں مگر یہاں دستور کے مطابق سارا بوجھ قدرت کے سر تھوپ دیا گیا اور اگر کوئی انکوائری ہوئی بھی تو اِس کی رپورٹ عوام کے سامنے نہیں آئی۔ حساب دوستاں در دل!!

بہر حال قائد ملتؒ جیسا وزیر اعظم جو پاکستان کو صحیح جمہوری ملک بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا' اور قائد اعظمؒ کے بعد تنہا ملک کی امیدوں کا سہارا تھا بغیر کچھ کہے یا وصیت کیے یا آخری پیغام دیئے' ایک بیوہ' دو کمسن بچے اور دو چار سگریٹ لائٹروں پر مشتمل جائیداد چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو گیا۔

خالی ہاتھ آیا تھا اور خالی ہاتھ چلا گیا۔ اپنوں سے اپنی عمر بھر کی خدمات کا یہ صلہ پا کر!

یہ واقعہ درکنار' حقیقت یہ ہے کہ نئے انتخابات کی بات وزیر اعظموں کے لیے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتی رہی' 1951ء میں لیاقت علی خاں مرحوم ابھی بقول اُن کی رازدار بیوی' نئے انتخابات کا اعلان کرنے والے تھے کہ اِس طرح مارے گئے۔ 1958ء میں فیروز خان مرحوم نون' وزیر اعظم' اِسی طرح 1956ء والے آئین کے تحت نئے جنرل انتخابات کا رسمی اعلان کرنے کے لیے لاہور سے کراچی پہنچے تھے کہ مارشل لاء لگ گیا اور خود ڈسمس ہو گئے۔

لیاقت علی خان مرحوم کیوں شہید کر دیئے گئے؟ سید اکبر کے علاوہ کوئی اور بھی اِس کام میں اُس کے ساتھ شریک تھا یا نہیں' قتل کسی سازش کے تحت ہوا یا یہ ایک انفرادی فعل تھا' سید اکبر کا پس منظر کیا تھا...... ؟ ان سوالات کے جوالات کم از کم مجھے معلوم نہیں' اُس زمانہ میں تو جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ اب اکتیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد اِن باتوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا' یا کسی شخص یا گروپ پر الزام دینا بے انصافی ہو گی۔

بہر حال جو کچھ ہوا وہ پاکستان کی بدقسمتی اور اس کے جمہوری خوابوں کی

پراگندگی پر منتج ہوا۔ البتہ نظر بظاہر' لیاقت علی خان مرحوم کی شہادت نوکر شاہی کے لیے وجہ ترقی درجات بن گئی۔ بقول شاعر ع

عالمے را زندہ کردی آفرین بر مُردنت

راتوں رات نوکر شاہی کے پروموشن ہو گئے اور پاکستان کی سیاست اور جمہوریت کی موت کے سامان ہو گئے۔ مثلاً:

(1) مفلوج غلام محمد مرحوم کو جس کو چودھری محمد علی مرحوم کے قول کے مطابق (صفحہ 294' چودھری صاحب کی کتاب (THE TASK BEFORE US) لیاقت علی خان مرحوم کابینہ سے نکالنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اب بیساکھیوں کے سہارے کھڑا کر کے گورنر جنرل کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا۔ (غلام محمد کے لیے یہ جگہ پیدا کرنے کی خاطر خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل سے ہٹا کر نام کا پرائم منسٹر بنا کر غلام محمد کے پاؤں تلے روند دیا گیا اور وہاں سے بھی پہلی فرصت میں اس کو ڈسمس کر کے بھیج دیا گیا۔)

(2) چودھری محمد علی مرحوم و مغفور سیکرٹری تھے۔ اب ترقی پا کر وزیر خزانہ بن گئے اور اس پوزیشن میں آ گئے کہ وہ پاکستان کی اقتصادی' معاشی اور مالیاتی پالیسیاں بناتے رہیں۔

(3) اسکندر مرزا مرحوم ترقی پا کر سیکرٹری دفاع بن گئے...... پھر گورنر مشرقی پاکستان بن گئے جہاں سے جست لگا کر وہ پہلے مرکزی وزیر اور بعد میں غلام محمد مرحوم کے جانشین یعنی گورنر جنرل بن بیٹھے۔

(4) خان قربان علی خان مرحوم' لیاقت علی خان کی شہادت والے واقعہ کے وقت وہاں کے آئی جی پولیس تھے۔ قتل کی انکوائری ختم ہو جانے کے بعد ان کو صوبہ بلوچستان کا سربراہ اے جی جی بنا دیا گیا۔

ان حضرات کے علاوہ نوکر شاہی کے باقی آدمیوں کے بھی نصیب کھل چکے تھے ان میں سے ہر چھوٹے بڑے کو اس من و سلویٰ میں سے کچھ نہ کچھ نوالہ تر مل گیا۔ آپ اس سال کی سول لسٹ جس میں افسروں کے نام اور ان کے عہدوں کی فہرست ہوتی ہے' سامنے رکھ کر خود دیکھ لیجئے کہ پاکستان میں اس وقت کون سے کلیدی عہدے

تھے اور ان پر کون کون ترقی پا کر بیٹھ گیا تھا؟ کس کس کو یکایک کیا کیا پروموشن ملا؟ پاکستان کی کون سی رگ رہ گئی جس میں نوکر شاہی کا نشتر نہ چبھا ہو۔

بڑے عہدے' مثلاً گورنر جنرل' وزارت وغیرہ تو سیاسی عہدے تھے اور یہ عوام کی مرضی اور ووٹ سے ہی تقسیم ہونے چاہیے تھے مگر یہاں یہ عہدے بھی بالا بالا نوکر شاہی کے آدمیوں نے آپس میں تقسیم کر لیے ...... عوام سے کسی نے نہیں پوچھا' پارٹی کی رائے کسی نے نہ لی۔

میں نے شروع میں ہی واضح کر دیا ہے کہ مجھے نوکر شاہی کے اس زمانہ کے بزرگوں کی حب الوطنی پر کوئی شک وشبہ نہیں۔ میں ان میں سے کسی کو بھی اس سازش میں ملوث نہیں سمجھتا۔ ان میں بہت اچھے آدمی بھی تھے۔ جو واقعتاً پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے تھے' کم از کم وہ لوگ دوسری قباحتوں سے جو بعد کی نوکر شاہی میں ڈویلپ ہوئیں' صاف اور پاک تھے' میں ان کے سیاسی عزائم یا محلاتی جوڑ توڑ کو بھی پاکستان دشمنی پر محمول نہیں کرتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ غالباً انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ خود پاور میں آ کر پاکستان کی خدمت' سیاستدانوں سے بہتر کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا یہ عمل آگے چل کر پاکستان کے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔ ان سے شکایت صرف اتنی رہ گئی کہ جب وہ سیاسی کام نہیں جانتے تھے تو انہوں نے سیاست میں ہاتھ ہی کیوں ڈالا؟ کیا وہ یہ حقیقت محسوس نہیں کر سکے کہ سیاست کے لیے STATES MENSHIP اور اعلیٰ درجہ کے تدبر اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صلاحیتیں ساری عمر عوام سے دور دفتروں کی تاریکیوں میں بیٹھ کر قلم چلانے والوں میں یکایک نہیں آ سکتیں؟ بالفاظ دیگر بیل گاڑی چلانے والوں کو ہوائی جہاز چلانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔

چند باتیں البتہ' اس بارے میں' لوگوں کے ذہنوں میں اب تک کھٹکتی رہی ہیں جن کے متعلق کوئی تسلی بخش EXPLANATION میسر نہیں ہو سکی ہے مثلاً:

(1) اگر نوکر شاہی کے لوگوں کے شروع سے ہی سیاسی عزائم نہیں تھے...... اگر ان کا ارادہ سیاست میں داخل ہونے اور سیاسی عہدوں پر قابض ہونے کا نہیں تھا...... اور اگر وہ پہلے سے یہ ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیاری نہیں کیے ہوئے تھے...... تو یہ کیسے ہوا کہ ادھر لیاقت علی خان مرحوم نے دم توڑا اور ادھر فٹافٹ جیسے کسی نے بجلی کا بٹن دبا دیا ہو' اسی رات کی تاریکیوں میں چند گھنٹوں کے اندر اندر' نوکر شاہی کے بزرگ خود کلیدی عہدوں پر بیٹھ گئے؟ نہ کوئی انتخاب ہوا نہ اسمبلی بلائی گئی نہ عوام سے یا پارٹی سے کسی نے پوچھا۔ کیا یہ کام کسی کمپیوٹر سے ہوا؟ میں اپنی طرف سے کوئی رائے نہیں دیتا۔

(2) دوسری الجھن والی بات خود لیاقت علی خان مرحوم کی شہادت والے واقعے سے تعلق رکھتی ہے گو کہ اس بات کا تعلق نوکر شاہی والے پہلو سے نہیں۔

آپ یہ اسٹوری سن چکے ہیں کہ دو گولیاں چلیں ایک سے لیاقت علی خان شہید ہو گئے اور دوسری سے ان کا قاتل اسی گھڑی ڈھیر ہو گیا۔

اب آپ کسی تجربہ کار نشانہ باز سے پوچھیے کہ یہ پیشگی سوچ' پلاننگ اور تیاری کے بغیر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ نشانہ باندھنے میں اس قدر پھرتی دکھائی جا سکتی؟ اور پھر جہاں بھگدڑ مچ گئی ہو' اور مجمع گتھم گتھا ہو' یہ کس طرح ہوا کہ قاتل کو مارنے والی گولی اس قدر صحیح طریقہ سے سیدھی محض قاتل کو جا کر لگی اور مجمع میں کسی اور آدمی کو اس گولی نے چھوا تک نہیں...... خاص طور پر گولی جبکہ ریوالور جیسے مشکل ہتھیار سے چلی۔ رائفل یا شاٹ گن سے بھی نہیں؟

میں ساری عمر شکار کھیلتا اور ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرتا رہا ہوں...... میری نظر میں یہ ناممکن تھا کہ پیشگی سوچ تیاری اور صحیح پوزیشن لیے بغیر اعصابی کھنچاؤ اور نفسیاتی الجھاؤ کی اس نازک گھڑی میں کوئی نشانہ باز اس قدر حاضر دماغی دکھا سکتا کہ اتنے بڑے مجمع میں وہ قاتل جیسے ایک متحرک نشانہ پر صحیح طور سے گولی بٹھا سکے...... اور وہ گولی بھی اس کے جسم پر اس جگہ پر پڑے کہ وہ بغیر پھڑ پھڑائے' ہاتھ پاؤں مارے یا کچھ بولے ٹھنڈا ہو جائے؟

یہ چند ایک کلیدی سوال تھے جن پر غور ہونا چاہیے تھا۔ غور ہوا یا نہیں ہوا اور اگر غور ہوا تو نتیجہ کیا نکلا یہ میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ کسی روز مستقبل کا کوئی محقق یہ کام سرانجام دے۔ میرے اپنے ذہن میں جو کچھ خدشات تھے۔ وہ میں نے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ میں یہ ماننے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں کہ یہ سب کام نیچر کی انجینئرنگ ENGINEERING کا تھا...... اکبر کا لیاقت علی خان پر گولی چلانا...... کسی شخص کا عین اسی لحظہ اکبر پر گولی چلا کر اس کو خاموش کر دینا...... اس کام میں نہ کسی رکاوٹ' نہ کسی

ایکسیڈنٹ' نہ کسی انسانی غلطی یا MISCALCULATION کا حائل ہونا ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس روز نیچر خود دنیا جہان کے کام کاج چھوڑ کر راولپنڈی میں یہ دیکھنے کے لیے بیٹھ گئی ہو کہ یہ نازک کام کسی رخنہ اور رکاوٹ کے بغیر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے!

بہر نوع یہ ظلم جس نے بھی کیا جس طرح بھی کیا اس کا نتیجہ (بالواسطہ) نوکر شاہی کے حق میں کسی قدر اچھا نکلا اور اس کے سیاست میں آنے کے لیے راستے کھل گئے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چار گروپ قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد وجود میں آ گئے تھے اور جن کا ذکر اس سلسلہ کی شروع والی قسط میں ہو چکا ہے ان میں سے بالآخر (اور اتفاقیہ ہی سہی) یہ نوکر شاہی والا گروپ ہی اس کھیل میں کامیاب رہا۔

کامیاب ہو جانے کے بعد اس گروپ کے آدمیوں نے جس طرح کہ 1951ء سے بعد کے دور کے لوگوں کو یاد ہو گا ملک کے حق میں کیا گل کھلائے اس کا تجربہ قدرے نقصان دہ رہا۔ مثلاً:......

کس طرح جمہوری اداروں کو تباہ کیا گیا؟

کس طرح سیاستدانوں کی تذلیل ہوتی رہی؟

(حتیٰ کہ قائد کی ہمشیرہ کا احترام بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا۔)

کس طرح آئین ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کو نیست و نابود کیا گیا؟

کس طرح آئین توڑا اور آئین توڑنے کی رسم رائج کی گئی؟

کس طرح وزیراعظم کو بغیر مسلم لیگ پارٹی سے پوچھے ڈسمس کیا گیا؟

کس طرح صوبائی وزارتوں کی توڑ پھوڑ ہوتی رہی اور اٹونامی کا اصول ٹوٹتا رہا؟

کس طرح صوبائی اسمبلیاں توڑی گئیں اور ان کا وجود بے معنی بن گیا؟

کس طرح عوام کے منتخب نمائندوں کو بے آبرو کر کے بھگا دیا گیا یا چمچہ بننے پر مجبور کیا گیا؟

کس طرح عوامی جمہوری عہدوں کا وقار زائل اور ان کی اہمیت و فعالیت ختم کر دی گئی؟

کس طرح عام انتخابات کو ہر دفعہ پیچھے دھکیل کر عوام کو عضو معطل بنا دیا گیا؟

کس طرح کوتاہ اندیشی پر مبنی پالیسیوں سے صوبائی تعصبات اور مرکز گریز رجحانات کو جنم دیا گیا؟

کس طرح نوکر شاہی کا جال وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا؟ عہدوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا (جس میں آدھا ملک چلے جانے کے بعد بھی کوئی تخفیف نہیں ہوئی) اور یہ خرچ پورا کرنے کے لیے بے دردی سے ٹیکسوں اور ڈیوٹیوں میں اضافہ ہونے لگا؟

کس طرح شاہ خرچیوں اور نوکر شاہی کی پرورش والے بوجھ کی وجہ سے غلط مالی پالیسیاں بنیں اور پاکستان ایک مقروض' محتاج اور گداگر ملک بن گیا؟

کس طرح غلط خارجہ پالیسیوں سے آزاد ملک کی SOVEREIGNITY کو مجروح کیا گیا اور اس کی سلامتی کو خطرہ میں ڈال دیا گیا؟

کس طرح باہر کے ملکوں کی یہاں خفیہ لابیاں کھلیں اور ہمارے ہی آدمی ان کے مفاد میں کام کرنے لگے؟

کس طرح اندرون ملک نفع اندوزی' رشوت خوری' کالونی سازی' اور اقربا پروری جیسی قباحتوں کی بنیاد پڑی؟

کس طرح ملکی انتظام پھس پھسا ہو کر رہ گیا۔ اکثر محکموں کی کارکردگی صحیح نہیں رہی اور پبلک۔ محصول بھی دیتی رہی اور پوری سروس نہ ملنے کی وجہ سے اپنا سر بھی پیٹتی رہی؟

خود لا اینڈ آرڈر' جان اور مال کی سلامتی بھی قصہ پارینہ بن کر رہ گئے۔

جب سول نوکر شاہی تھک گئی تو کس طرح اس نے ایوب خان والوں سے شامل ہو کر مارشل لاء لگوا کر ان کے زیر سایہ راج کرنا شروع کر دیا؟

کس طرح سیاست اور جمہوریت کی آبرو ختم ہو گئی؟

کس طرح اچھے آدمی سیاست کو خطرناک کام سمجھ کر گوشہ نشین ہو گئے اور ان کی جگہ چمچوں نے لے لی جنہوں نے اس نئی سیاست کا مقصد محض پرمٹ' پلاٹ اور مالی منفعت کا اصول قرار دے دیا؟ (جب سیاست کے مقاصد بدل جاتے ہیں اور سیاست کی آبرو نہیں رہتی تو چمچہ قسم کے موقع پرست لوگ سیاست کو انہیں چیزوں کے لیے استعمال کرتے ہیں...... یعنی گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔)

چمچوں کا رواج اور کارپوریشنوں اور بورڈوں کی بھرمار

قائد ملت" کی شہادت واقع ہوتے ہی نوکر شاہی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد جو نقصان دہ ملکی پالیسیاں بنائیں ان کی طرف پچھلے مضامین میں اشارہ ہو چکا ہے۔

ان پالیسیوں کا تفصیلی جائزہ تو بعد میں ہو گا فی الحال صرف دو موٹی جراحتوں کی نشاندہی کروں گا جو نوکر شاہی کی کوتاہ اندیشی' خود غرضی اور سیاسی معاملات میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے قوم کو برداشت کرنی پڑیں یعنی:

(1) ایک تو انہوں نے سیاست میں چمچوں کو مروج کیا۔

(2) دوسرا' عوام کے منتخب نمائندوں (وزیروں اور اسمبلیوں) کو انتظامی امور سے عملاً بے دخل کرنے کی نیت سے۔ انہوں نے کارپوریشنوں' خود مختار باڈیز' بورڈوں اور اتھارٹیوں (جو سب نوکر شاہی کے اپنے آدمیوں پر مشتمل ہوتی تھیں) کا رواج ڈالا۔ اس سے ان کے دو مقاصد تھے۔

(1) ایک تو اکثر انتظامی اداروں اور شعبوں پر سے عوام کا براہ راست' اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے کنٹرول اور عمل دخل ختم کرنا' تاکہ انتظامیہ کی طرف سے جو بھی تکلیف عوام پر نازل ہو (مثلاً بجلی پانی بند...... دفتروں کا دوکانوں میں تبدیل ہو جانا...... انصاف عنقا...... جرائم کی بہتات...... شہریوں کی جان ومال اور آبرو غیر محفوظ) تو عوام خود اس کا کوئی علاج نہ کر سکیں اور چڑیا گھر

کے جانوروں کی طرح خموشی سے ہر تکلیف برداشت کرتے رہیں۔

(2) دوسرا مقصد تھا رشوت خوری کے لیے آسانیاں فراہم کرنا۔ ایوبی دور کی ایک خاص عنایت یہ تھی کہ انہوں نے بی ڈی (بنیادی جمہوریتوں) کا ڈھکوسلہ کھڑا کر کے رشوت خوروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کیا جو بدقسمتی سے پبلک کے نچلے درجے کے لوگوں پر مشتمل تھا اور اس کی اس لیے ہمت افزائی کی گئی تاکہ رشوت خوری عوام کے اپنے گھروں تک پہنچ جائے اور اس قدر عام ہو جائے کہ بدنامی کا سارا بوجھ محض نوکر شاہی کو نہ اٹھانا پڑے۔

اب پہلے چمچوں کے نزول کا حال سنیے۔

1951ء میں مرحوم غلام محمد کا راج شروع ہوا۔ اس نے وزیراعظم ناظم الدین مرحوم کو ڈسمس کیا۔ بوگرہ مرحوم کی سرکردگی میں چمچوں پر مشتمل وزارت بنوائی' پھر بوگرہ مرحوم کو پستول دکھا کر اس سے آئین ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں تڑوائیں اور جسٹس محمد منیر سے سیاسی فیصلہ حاصل کر کے اپنی جملہ غیر جمہوری کارگزاریوں کو قانونی "کور" دلوادیا۔ یہ چمچہ سازی کا پہلا دور تھا۔

دوسرا دور چمچہ سازی کا اسکندر مرزا والا دور تھا۔ اس دور میں چمچوں کے بغیر اس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جب "کنٹرولڈ ڈیموکریسی" کی باتیں کرتا تھا تو اس کی مراد یہ ہوتی تھی کہ چمچہ سازی کی صنعت کو فروغ حاصل ہو۔ اس نے مسلم لیگ کو تڑوا کر ری پبلکن پارٹی کی بنیاد ڈلوائی اور مسلم لیگ کے بھگوڑوں کو وزارتیں دلوا کر چمچوں کے حلقوں کو وسعت بخشی اور سیاست پر سے جماعتی کنٹرول ختم کروادیا۔ (اس حادثہ پر سردار عبدالرب نشتر مرحوم صدر مسلم لیگ روتا رہ گیا) آگے چل کر مرزا صاحب مرحوم نے نوکر شاہی کو مزید تقویت پہنچانے کی غرض سے ایوب خان مرحوم سے ساز باز کر کے اس کو سیاست کے میدان میں لے آیا۔ 1956ء والا آئین جس سے وفاداری کا اس نے خود حلف اٹھایا ہوا تھا' اس کو منسوخ کر دیا۔ پارلیمینٹ توڑ دی' عوامی منتخب نمائندوں پر مشتمل وزارتیں ختم کر دیں اور ان کی جگہ پر مرکز میں ایوب خان مرحوم کی سربراہی میں ایک بوگس وزارت نامزد کر دی جس میں سرکاری ملازموں کے علاوہ پبلک کی طرف سے چند نئے پرانے چمچے بھی بھرتی ہو گئے۔ ایوب خان مرحوم کے

انتظامیہ کا سربراہ نوکرشاہی کا ایک سینئر افسر بنا جس کو ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا اضافی اعزاز بھی بخشا گیا۔ یعنی اب سول افسر' ایوبی افسر اور چمچے سب اکٹھے ہو گئے اور جمہوریت کا تصور ہی ملیامیٹ ہو گیا۔

تیسرا دور چمچہ سازی کا ایوب خان مرحوم اور یحییٰ خان مرحوم والا دور تھا۔ یہ دور چمچوں کے انتہائی عروج کا تھا۔ ہر ادارے پر وہ چھا گئے تھے۔ ان کے استفادہ کے لیے بوگس مسلم لیگیں بنیں؟ بنیادی جمہوریتوں کا فراڈ چلا' خانہ ساز وزارتیں وجود میں آئیں۔ جعلی اسمبلیاں "منتخب" ہوئیں۔ ایک عدد جھوٹا آئین نافذ ہوا۔ قوم کے سچے نمائندوں کی تذلیل کے لیے ایبڈو بنا۔ سہروردی مرحوم اور خان قیوم مرحوم کے پایہ کے قومی لیڈروں کو جیل میں ڈالا گیا۔ ملک کی دولت سکڑ کر بائیس گھرانوں پر مشتمل چمچوں کے قبضے میں آگئی۔ بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے رشوت خوری اور غبن معاشرہ کی جڑوں تک پہنچ گئے۔ مشرقی پاکستان والوں نے چھ پوائنٹ پیش کر دیے۔ ایک چمچہ کو وہاں کا گورنر بنایا گیا جو آخر میں قتل ہو گیا۔ اگرتلہ اسٹیج ہوا' نتیجتاً مغربی پاکستان جج اپنے جوتے بطور یادگار چھوڑ کر ننگے پاؤں وہاں سے نکل آیا۔ ملٹری ایکشن ہوا۔ بنگلہ دیش بن گیا۔ نوے ہزار سے اوپر ہمارے لوگ جنگی قیدی بن کر بھارت میں محبوس ہو گئے۔ اسی دور ایوبی کا ایک شاہکار یہ بھی تھا کہ جس شہر کراچی کو قائداعظمؒ نے خود دارالحکومت کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہاں سے دارالحکومت کو اٹھا کر مرغلا کے ویرانوں میں لگا دیا تاکہ نوکرشاہی دنیا سے دور عوام کی نظروں سے اوجھل' اپنے علیحدہ قلعے میں بیٹھ کر اختیار چلائے اور کراچی کے عوامی اثر اور دخل اندازیوں سے محفوظ رہے۔ (1959ء تک کراچی مہاجروں کی اکثریت کا شہر بن گیا تھا۔)

جمہوریت کے نقطۂ نظر سے ان تینوں ادوار کا خلاصہ یہ رہا کہ ہر دور میں چمچوں کا بول بالا رہا اور باقی سارے ادارے اور ساری قدریں ڈوب گئیں' قائداعظمؒ اور قائدملتؒ کے جمہوری اصولوں اور محنت پر پانی پھر گیا' اسمبلیاں مسخروں کی محفلیں' وزارتیں چمچوں کی کمین گاہیں' سرکاری پارٹیاں گونگوں' بہروں اور بے ضمیروں کی جماعتیں اور اکثر سرکاری دفاتر دکان بن گئے۔ خود سربراہانِ مملکت کی اردگرد درباری اور خوشامدی چمچوں کے حلقے قائم ہوتے رہے جن کا کام صرف یہ تھا کہ وہ اپنے آقاؤں

کو صحیح صورتحال سے بے خبر اور ذہنی طور پر عوام سے دور رکھ کر ان سے غلط کام کرواتے رہیں کبھی کوئی سربراہِ مملکت بدلتا تھا۔ تو پرانے چمچوں کی جگہ نئے چمچے آ جاتے تھے مگر نظام اور ماحول وہی درباری رہتا تھا۔

آپ پوچھیں گے کہ چمچوں سے مراد کون لوگ تھے؟ ان کی پہچان کیا تھی؟ ان کا کام کیا تھا؟ ان کا کردار کیا تھا؟

جب پاکستان سے جمہوریت اور سیاست دانوں کا صفایا کر دیا گیا اور غلام محمد مرحوم کا دور شروع ہوا تو دنیا کو دکھانے کے لیے نوکرشاہی کو کچھ سیاسی خانہ پُری کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس خانہ پری کے لیے ایسے لوگوں کو لفٹ دے کر سامنے لایا گیا جن کی سیاست محض موقع پرستی تھی اور سستے داموں بک رہے تھے۔ انگریز کے زمانہ میں بھی ایسے کچھ لوگ ہوتے تھے' جن کو "ٹوڈی" کہا جاتا تھا' عوام کو ان سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ جہاں منہ نکالتے تھے۔ ان پر "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کی آوازے کسی جاتی تھیں۔ بعد میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تو یہ لوگ خود بخود ختم ہو گئے۔ قائداعظمؒ نے خاص طور سے کوشش کی کہ ان کی سیاست میں اس قسم کے بداخلاق لوگ ہرگز گھسنے نہ پائیں مگر قائدین کے انتقال اور نوکرشاہی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان لوگوں کے لیے پھر مارکیٹ کھل گئی اور ان کی مانگ بڑھ گئی۔ عوام نے اس مرتبہ ان پر "ٹوڈی" کی جگہ "چمچہ" کا نام رکھا۔ یہ لفظ "چمچہ" پہلی بار غلام محمد مرحوم کے دور میں پاکستان کی سیاسی لغت میں داخل ہوا اور اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے لگا۔

چمچوں کی پہچان یہ تھی کہ وہ سر تاپا موقع پرست ہوں' بے ننگ و نام ہوں' عوام میں ان کا کوئی مقام نہ ہو' عوام ان سے بیزار اور وہ عوام سے بے نیاز ہوں' کسی عام انتخاب میں ان کا منتخب ہو کر آنا ممکن نہ ہو' عوام کے بھلے کا ان کو کوئی خیال نہ ہو' عزت نفس اور خودداری ان میں ناپید ہو۔ ان کی زندگی کا اصول ہو۔ "کتنی ہے میرا نام جس کا کھاؤں اس کا گاؤں۔" کسی گندے سے گندے کام کرنے میں بھی ان کو تامل نہ ہو۔ ان کا آقا ایک احمقانہ بات منہ سے نکالے تو یہ لوگ ہز ماسٹرس وائس' کی طرح ہزار باتیں اس مضمون کی بنالیں اور بے دھڑک الٹے سیدھے بیان دیتے پھریں۔ (کوئی سنے یا

نہیں' اعتبار کرے یا نہیں' اس سے ان کو کوئی غرض نہیں) سیاسی کیریکٹر کے لحاظ سے "قومے فروختند چہ ارزاں فروختند" کی جیتی جاگتی تصویریں اور عوام میں وقار یا آبرو کے خیال سے غالب مرحوم کے اس شعر کا سو فیصد مصداق:

بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اترائے
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

ان لوگوں کی آبرو باختگی کی قیمت صرف یہ تھی کہ وقتی طور پر ان کی تھوڑی سی نام و نمود ہو' اخبارات میں فوٹو چھپیں اور ذاتی منفعت اثر و نفوذ یعنی ملازمتیں' پرمٹ' پلاٹ' چھوٹے افسروں پر رعب' مقامی جھگڑوں اور مقدمہ بازیوں میں مدد حاصل ہو' بعض چمچوں نے موقعہ کا فائدہ اٹھا کر کافی ناجائز دولت بھی اکٹھی کر لی۔ موقع کی ان کو خوب پہچان تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ یہی وقت ہے لوٹ مار کا' کیونکہ جب جمہوریت واپس لوٹی اور قوم کے منتخب نمائندوں نے دوبارہ اقتدار پر قبضہ کر لیا تو یہ کہیں کے نہیں رہیں گے' لہٰذا موقع کو غنیمت سمجھ کر وہ جتنی پونجی بنا سکتے تھے بنالی اور یہی تھا مقصد ان کے چمچہ بننے کا۔ ان کی پست فطرت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ وزیروں کی بھرتی کے لیے تھانیداروں اور تحصیلداروں سے سفارشیں منگوائی جاتی تھیں اور ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کے نام بھیجیں جن کے بڑے انگریز کے ٹوڈی رہ چکے ہوں اور خود بنیادی بے اصول چمچے ہوں' چنانچہ وزارتوں کے امیدوار شروع میں تو اس مقصد سے تھانوں اور تحصیلوں کے طواف کرتے پھرتے تھے مگر جب وزیر بن جاتے تھے تو ان کی لن ترانیاں سننے کی چیزیں ہوتی تھیں۔ ایوب خان کے دور میں بعض وزیروں کا تکیہ کلام "کچلنا" ہوتا تھا یعنی ان کی ہر تقریر کی انتہا اس جملہ پر ہوتی تھی کہ "اگر یہ نہ ہوانہ تو ہم اس کو کچل دیں گے' کچل کر نام و نشان مٹا دیں گے۔"

قضا الٰہی ایوب خان گیا تو ان چمچوں کی بھی شامت آ گئی۔ وہ ایسے کچلے گئے کہ پھر کسی نے ان کو نہیں دیکھا' البتہ جتنے دن وہ نوکر شاہی کے دیئے ہوئے اقتدار میں رہے کافی اودھم مچائے رکھا۔

نوکر شاہی اقتدار پر قابض ہو جانے اور اپنی پسند کے چمچے وزارتوں اور

اسمبلیوں میں جمع کرنے کے بعد' اس کوشش میں رہی کہ کوئی ایسی رسم نکالی جائے جس سے مستقل طور پر عوام کا اثر انتظامیہ پر سے ختم ہو جائے اور ایسے اداروں کی حیثیت کو ہی برباد کر دیا جائے جن اداروں کے ذریعے' حالات تبدیل ہو جانے کی وجہ سے' امکان تھا کہ عوام دوبارہ کسی وقت طاقت میں آ کر نوکر شاہی کی خودسری کو ختم کر دیں گے۔

یہ ادارے تھے عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل وزارتیں اور اسمبلیاں فوری طور پر تو نوکر شاہی نے اپنے چمچے لا کر ان اداروں کو بے اثر بنا دینے کا انتظام کیا ہوا تھا مگر پھر بھی یہ خطرہ موجود تھا کہ مستقبل میں کہیں ملک کے حقیقی مالک یعنی عوام جاگ نہ اٹھیں اور نوکر شاہی کے کیے کرائے کو ختم کر ڈالیں' لہٰذا انہوں نے بہ نظر پیش بندی ایک ایسی رسم نکالی جس سے یہ ادارے ہمیشہ کے لیے بے اختیار اور بے کار ہو جاتے تھے۔

یہ رسم کیا تھی؟

رسم یہ تھی کہ خاص الخاص نوکر شاہی کے اپنے ادارے بنا کر سارا ایگزیکٹو اختیار ان میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ وزیر اور اسمبلیاں محض اوپر ہی اوپر کی ہوا کھاتی رہ جائیں۔ ان اداروں کو کہا جانے لگا:

(1) کارپوریشن۔
(2) آٹانامس باڈیز۔
(3) بورڈ (مثلاً بورڈ آف ریونیو' ریلوے بورڈ وغیرہ)
(4) خاص اتھارٹیاں۔
(5) اسپیشل ایکسپرٹ کمیٹیاں۔
(6) سلیکشن بورڈ۔
(7) کمیشنیں' وغیرہ وغیرہ۔

اس رسم کے تحت مزید یہ فائدہ بھی ملحوظ رہا کہ نوکر شاہی کے آدمیوں کو دولت کمانے کالونیاں بنانے' بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی آزادی رہے۔ یہ مقصد محض اس صورت ہی حاصل ہو سکتا تھا جب کروڑہا عوام کی آنکھوں سے پوشیدہ رہا جائے اور ان کے نمائندوں کے کنٹرول اور دخل

اندازیوں کا کوئی خطرہ نہ رہے۔

یہ رسم اپنی جگہ پر قطعاً انوکھی تھی اور اس وقت تک دنیا کے کسی اور آزاد جمہوری ملک میں رائج نہیں تھی۔ مثلاً امریکہ میں جتنے اہم بالائی ادارے بنتے ہیں تو وہ کانگریس اور سینٹ کے ممبروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں ہر کام کے لیے پارلیمنٹ کی اپنی سیلیکٹ کمیٹیاں ہوتی ہیں اور اگر کوئی ڈیپارٹمنٹل کمیٹی بنائی بھی جاتی ہے تو اس کا سربراہ لازماً عوام کا منتخب کردہ کوئی نہ کوئی وزیر ہوتا ہے' حتیٰ کہ سکیورٹی اور دفاع جیسے نازک محکموں سے متعلق ادارے بھی عوام کے منتخب نمائندوں کی سربراہی میں ہی کام کرتے ہیں۔

مجھے کسی جمہوری ملک میں ایسی مثال نظر نہیں آئی کہ سارا اختیار تو شتر بے مہار نوکر شاہی کے پاس رہے اور وزیر اور عوامی نمائندے محض اس لیے رہ جائیں کہ وہ اپنے آقاؤں یعنی نوکر شاہی کی تعریف اور تائید میں بے تحاشا بیان دیتے پھریں۔ (مغز ماخورد حلق خود بدرید)

اب اس پس منظر کو سامنے رکھ کر آپ خود حساب لگا لیں کہ قائد ملتؒ کی شہادت کے بعد کتنے کارپوریشن' آٹانامس باڈیز' کمیشنیں' اتھارٹیاں بورڈ' ڈیپارٹمنٹل کمیٹیاں' واپڈائیں' اکنک' پلک اور پکنک بنیں جو سو فیصد نوکر شاہی کے آدمیوں پر مشتمل رہیں اور جن کے ہاتھوں میں حقیقی اختیار رہا۔

عوام اس دور کے شکایت کرتے رہے کہ رشوت بڑھ گئی اور انتظامیہ کی کارکردگی درست نہیں رہی۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ ابتری کہاں سے شروع ہوئی؟ کس زمانہ میں شروع ہوئی؟ اس کا ذمہ دار کس کو سمجھا جائے؟ عوام کے نمائندے تو قائد ملت کے زمانہ کے بعد بے دخل ہو چکے تھے۔ اور ان کی جگہوں پر جو بیچے لائے جاتے تھے وہ بھی بالکل بے اختیار یتیم تھے۔ تو پھر رشوت کے کاروبار کا ذمہ دار کون ٹھہرا؟ یہ لوٹ مار کیوں ہوتی رہی؟ کون کرتا رہا؟

اگر آپ بہ نظر غائر دیکھیں گے تو آپ کو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ نوکر شاہی کے یہ محل اور یہ کالونیاں اس قدر جلد کیسے بنیں؟ رشوت خوری کیوں بڑھی؟ جرائم میں کیوں اضافہ ہونے لگا؟ بدعنوانیوں اور بدانتظامی کا کس طرح دور دورہ شروع

ہوا؟ مختلف محکموں کی کارکردگی کیوں متاثر ہوئی؟ نوکر شاہی کے چھوٹے بڑے پرزوں کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی؟ اور پبلک کیوں چیخ و پکار کرتی پھری کہ اس سے محصول اور ٹیکس تو سختی سے وصول کیے جاتے تھے مگر ان کو پوری سروس نہیں ملتی تھی؟ آئے دن بجلی بند' پانی بند' بینکوں پر ڈاکے' گھر غیر محفوظ' ٹیلی فون پر شکایت کرتے تھے' تو جواب آتا تھا کہ "صاحب میٹنگ میں ہیں۔"

میرے دیکھتے ہی دو عالمی لڑائیاں ہو گزریں۔ ان کے دوران میں بلیک مارکیٹ بھی چلی' نفع اندوزی بھی ہوتی رہی۔ انتظامیہ کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا مگر نہ نوکر شاہی کی کالونیاں بنیں نہ بدنظمی پھیلی۔ ہر چیز ایک حد کے اندر رہی۔ عوام مطمئن رہے کسی نے سرد آہیں نہیں بھریں۔

ظاہر ہے کہ دنیا کے وہ مدبر بے وقوف یا ملک دشمن نہیں تھے جنہوں نے جمہوری نظام کو افضل ترین نظام سمجھا اور نوکر شاہی کو ہر حال میں عوام کے منتخب نمائندوں کے کنٹرول کے تحت رکھا اور اس قدر آزاد نہ چھوڑا کہ وہ اپنی غرض کی خاطر یا اپنی ناتجربہ کاری اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے عوام کی زندگی اجیرن اور ان کی آزادی بے ثمر بنا دیں۔

نوکرشاہی کی شاہ خرچیاں اور ملک محتاج، مقروض اور گداگر!

قائداعظمؒ ایک کفایت شعار انسان تھے۔ قائد ملتؒ مرحوم بھی قومی خزانے سے خرچ کے معاملے میں کم محتاط نہیں تھے۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے دور میں دو اصولوں پر کاربند رہے۔

(1) پہلا اصول

نوکرشاہی کا حلقہ مختصر اور محدود ہو۔ اس کے پالنے پر خرچ اس قدر کم ہو کہ اپنے ملکی وسائل آمدنی اس کی کفالت کر سکیں۔ مہذب اور جمہوری حکومتیں وہ ہوتی ہیں جن کی موجودگی، گرفت اور بوجھ عوام کو کم سے کم محسوس ہو اور یہ حال نہ ہو کہ انتظامیہ تعداد یا خرچ کے لحاظ سے ایک ایسی وزنی زنجیر بن کر لوگوں کے گلے میں پڑ جائے کہ اس کی اذیت عوام ہر کروٹ پر محسوس کرتے ہوئے اس کو اتار پھینکنے کے لیے سارا وقت تڑپتے رہیں۔

(2) دوسرا اصول

ملک کی آزادی تب بامعنی ہو سکتی ہے جب مالی معاملات میں ملک کا مدار اپنے ہی ذرائع آمدنی اور اپنے عوام کی ہی قوت بازو اور حقیقی توانائیوں پر رہے اور اس کو دوسروں کا محتاج یا مقروض یا ایک عادی بھکاری بن کر نہ رہنا پڑے۔

بدقسمتی سے قائدین کے رخصت ہوتے ہی ملک پر نوکرشاہی قابض ہو گئی اور اس نے انتہائی بے دردی اور کمال جرأت سے یہ دونوں اصول توڑ ڈالے۔ یہ نوکرشاہی کا دور 1951ء سے شروع ہوا اور مرحوم غلام محمد گورنر جنرل اس کے باوا آدم تھے۔

پہلے تو نوکرشاہی نے اپنا جال اس قدر پھیلایا کہ عہدوں کی تعداد گنتی سے باہر ہو گئی۔ گلستانِ پاکستان کے کسی شجر کی ایسی کوئی شاخ نہیں رہی جس پر نوکرشاہی کا کوئی نہ کوئی بلبل بیباک بیٹھ کر محو موسیقی نہ ہو گیا ہو۔ شہریوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا گیا جس کو نوکرشاہی نے اپنی تحویل میں نہیں لے لیا۔ یہ رجحان منزل بہ منزل بڑھتا رہا، حتیٰ کہ صدیوں کے گزرے ہوئے بزرگوں کے مزاروں کو بھی نہیں چھوڑا، ان پر بھی اوقاف کے غلط نام سے اپنا پہرہ بٹھا دیا۔ دفاتر میں جس کام کے لیے پہلے ایک افسر ہوتا تھا اب وہاں صدہا نئے آدمی لگا دیئے گئے۔ محکمے اور محکموں کی ڈویژن اتنی بڑھیں کہ حد و حساب نہ رہا۔

آپ نوکرشاہی کے زمانہ کے بجٹوں کا قائدین کے بجٹوں سے موازنہ کیجئے ساری تصویر کھل کر آپ کی آنکھوں کے سامنے آ جائے گی۔ ایسا لگے گا جیسے ٹڈی دل کا لشکر آیا اور کھیت کھا گیا۔

پھر یہ خرچ کیسے پورا ہونے لگا، ہر چیز پر ٹیکس! قدرت کی دی ہوئی نعمتوں ہوا، پانی وغیرہ پر بھی ٹیکس! اور جب اس کے بعد بھی خرچ پورا نہیں ہونے لگا تو قرض، امداد، دوسروں کی منت کشی اور محتاجی، گداگری!!

ٹیکسوں کے عوض عوام کو کیا "سروس" میسر ہوئی؟ اور کیا فائدے پہنچتے رہے؟ رشوت میں کوئی تخفیف؟ محکموں کی حسن کارکردگی؟ جان اور مال کی سلامتی؟ جرائم میں کمی؟ راستوں کی حفاظت؟ ٹرینیں صحیح وقت پر اور ایکسیڈنٹوں سے محفوظ؟ وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ!!!

مشرقی پاکستان کا المیہ پیش آیا تو خیال تھا کہ آدھا پاکستان کٹ جانے کے بعد اب نوکرشاہی کا تعدادی اور مالی بوجھ بھی نصف رہ جائے گا مگر یہ بھی نہیں ہوا...... پاکستان کا رقبہ تو گھٹ گیا مگر نوکرشاہی کا رقبہ بڑھتا ہی رہا۔

اب آیئے تو بعد کی اس افراتفری کے سیاق و سباق میں ذرا پیچھے ہٹ کر اس

ملک کی بنیاد ڈالنے والے قائدین کی پالیسیوں پر ایک نظر ڈالیں۔

قائداعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ ملک کی آزادی محض اس صورت میں بامعنی ہو سکتی ہے کہ جب مالی معاملات میں بھی ملک کا مدار اپنے ہی ذرائع آمدنی اور اپنے ہی عوام کی قوت بازو پر ہو۔ ایک مقروض، محتاج یا خیرات اور بیرونی امداد پر جینے والا ملک آزادی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

فوری طور پر ذرائع آمدنی کی کمی قائدین کے لیے حوصلہ شکن نہیں تھی۔ جاپان، جرمنی، چین، اسرائیل کی مثالیں ان کے سامنے تھیں۔ یہ ملک اپنی تعمیر کے لیے اپنے ہی وسائل اور دماغی صلاحیتوں پر انحصار کرنے لگے تھے۔ نہ قرض لیتے تھے، نہ باہر والوں سے بھیک مانگتے تھے۔ ان کی تعمیر کی رفتار آہستہ اور تدریجی ضرور تھی، مگر یقینی اور پختہ بنیادوں پر ہونے لگی تھی۔

قرض اور گداگری کی علت جس طرح افراد کی قوت عمل کو ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح قوموں کو بھی سست اور کاہل بنا دیتی ہے۔ علاوہ اس کے یہ علتیں قوموں کے وقار اور احساس خودداری کو بھی فنا کر دیتی ہیں۔ مقروض اور گداگر قوم کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ منہ سے اگر کوئی طعنہ نہ بھی دے مگر دل میں اس سے کراہت ضرور محسوس کرتا ہے۔

سب سے ضررناک بات یہ ہے کہ مقروض اور محتاج قوم کی خارجہ پالیسی بھی آزادانہ نہیں ہو سکتی۔ ہر قدم پر اس کو سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں کوئی قرض یا امداد یا خیرات دینے والا ملک اس سے ناراض نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نادار ملک اپنی اس مجبوری کے باعث مالدار ملکوں کے آپس کے جھگڑوں میں خواہ مخواہ پھنس جاتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی آزادی تک کھو بیٹھتے ہیں۔

قائدین کے سامنے مسئلہ کے یہ سارے پہلو رہے جب انہوں نے پاکستان کے لیے روز اوّل سے یہ پالیسی وضع کی کہ اخراجات کے معاملہ میں اس کو اپنے ملکی وسائل کے مطابق ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ محدود آمدنی والا آدمی اگر پہلے ہی روز ہاتھی یا رولس رائس کی سواری کی تمنا نہ کرے تو اس کو کوئی طعنہ نہیں دے گا۔ طعنہ تب دے گا اور حقارت سے تب دیکھے گا جب انسان قرض یا خیرات کے پیسے سے پہلے

روز ہی ہاتھی خریدے یا سواری کے رولس رائس رکھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ مرحوم راجہ غضنفر علی خان مجھ سے ملنے کے لیے خیلا تشریف لائے۔ انہوں نے بتایا کہ جب ان کو سفیر بنا کر بعض مسلمان ملکوں میں بھیجا جا رہا تھا تو ان کو قائدین کی طرف سے یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ پاکستان کی مالی ضروریات کا ذکر کر کے ’غیروں کی نظروں میں پاکستانی قوم کی خودداری اور عزت کو خراب نہ کریں۔ راجہ صاحب اس موقع پر چین کا دورہ کر کے خیلا پہنچے تھے۔ وہ چین کی نئی انقلابی قیادت سے اس بنا پر سخت متاثر تھے کہ وہ اپنے ہی قوت بازو اور ملکی وسائل سے اپنا ملک بنا رہی تھی، کسی مالدار ملک کے سامنے اپنا دامن نہیں پھیلا رہی تھی۔ امریکی جنرل مارشل شروع میں ہی امداد کی آفر لے کر وہاں پہنچا تھا مگر اس کو یہ جواب دے کر واپس کر دیا گیا کہ ”نیا چین غریب ہی سہی...... خانہ جنگی اور جاپانی قبضہ کی وجہ سے...... فی الحال تباہ حال ہی سہی، مگر وہ اپنی ہی قوت سے پھر اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ دوسروں کے سہارے نہیں۔“

قدرت خدا، دو سال بعد میں خود سفیر بن کر چین گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بھی چین میں وہی صورتحال دیکھی جس کا ذکر غضنفر علی خان مجھ سے کر گئے تھے بلکہ اس وقت تک تو چینیوں نے اپنے ہم خیال روسی کمیونسٹ صلاحکاروں کو بھی اپنے یہاں سے محض اسی بناء پر راتوں رات بھگا دیا تھا کہ وہ اپنے کو چین کا محسن سمجھنے لگے تھے۔ یہ بات چین نے اپنی قومی وقار اور آزادی کے منافی سمجھ کر روس سے دشمنی مول لے لی مگر روسیوں میں اس احساس کا پیدا ہونا کہ وہ چین کے محسن ہیں۔ گوارا نہیں کیا۔

انہیں دنوں ایک مرتبہ مجھے چین کا ایک لیڈر بغرض سیر و تفریح پیکنگ کے قریب سمر پیلس لے گیا وہاں ہم کشتیوں میں گھوم رہے تھے۔ آپس کی گفتگو بے تکلفی کے انداز میں ہونے لگی۔ چین کے اس وقت کے حالات کا ذکر چھڑا میں نے رازدارانہ اور مخلصانہ انداز میں کہا کہ: ”چین میں ہنوز کئی چیزوں کی کمی نظر آ رہی ہے، مثلاً ریل گاڑی میں کپلنگ کی جگہ رسیاں باندھی جاتی ہیں، فوٹو نکالنے کے لیے لکڑی کے بکسوں میں لینز لگا کر ان سے کیمرہ کا کام لیا جاتا ہے، ہسپتالوں میں پچاس سال کی پرانی ایکسرے مشینیں استعمال کی جا رہی ہیں۔ کیوں نہ بعض دوسرے ملکوں کی طرح چین بھی امریکی مزاج سے فائدہ اٹھاتا ہے جبکہ امریکہ ساری دنیا میں بے تحاشا پیسے پھینک رہا ہے اور ہر

حاجت مند ملک اس کو جھانسے دے کر اپنی ضرورتیں پوری کر رہا ہے؟"

میرے میزبان نے یہ جواب دیا: "جو چین امریکہ یا کسی دوسرے ملک کی مدد کے سوا اپنی تعمیر نہیں کر سکتا' ہم اس چین کو اپنے ہاتھوں سے دفن کرنا پسند کریں گے۔ بہ نسبت اس کے کہ اس کو دوسروں کے سہارے اٹھتا دیکھیں۔"

یہی عزم اور یہی احساس خودداری تھا جس کی بدولت چین نے چند سال کے اندر ایٹم بم بنا لیا اور امریکہ کا صدر بہ نفس نفیس ٹوپلا ہاتھ میں لیے ان کے یہاں حاضریاں بھرتا دیکھا گیا۔

بہ خدا ہمارے قائدین کا عزم اور احساس خود اعتمادی بھی چینیوں کے عزم اور احساس خود اعتمادی سے کم نہیں تھا۔

ان کے اس شان استغنا کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ان کا اپنی قوم پر کامل اعتماد تھا اور اس کی خداداد صلاحیتوں کا ان کو پورا پورا اندازہ تھا' ان کو یقین تھا کہ اس قوم میں سیاسی شعور' ہے ذہانت ہے' ہمت ہے اور قربانی کا مادہ ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان پڑھ ہوتے ہوئے اس قوم نے کس طرح اپنا ووٹ استعمال کیا تھا۔ نظریہ پاکستان کی خاطر اس نے کس طرح اپنے گھربار لٹا دیئے' غیرت کا یہ عالم کہ مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے غسلخانہ کے حرمت کی خاطر اس نے اپنے کشتوں کے پشتے لگوا دیئے۔ قربانی کا یہ انداز کہ قوم کی آدھی آبادی نے محض اس وجہ سے ہندو کی رعایا بن کر رہنا گوارا کر لیا کہ کم از کم قوم کا دوسرا حصہ تو آزاد ہو جائے اور سیاسی کیریکٹر کی پاکیزگی کی یہ کیفیت کہ انتخابات کے دوران ہندوؤں کی ساری دولت اس کے ووٹ خریدنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ (اگر قائد اس لیے ٹھہر جاتے کہ یہ قوم ان پڑھ ہے اور جب تک پڑھ نہ لے اس سے کوئی کام نہ لیا جائے اور اس کے ساتھ فی الحال مویشیوں جیسا سلوک کیا جائے تو نہ پاکستان تحریک چلتی اور نہ پاکستان بنتا۔)

ایسی قوم سے کیا کام نہیں لیا جا سکتا تھا؟ اس سے کیا قربانیاں نہیں کروائی جا سکتی تھیں؟ اگر ان کو اس قوم کی پامردی کا یقین نہیں ہوتا تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ان دنوں وہ بھارت کو پہلے مکا دکھاتے تھے اور اس کے بعد ہی اس سے کوئی بات کرتے تھے؟

البتہ قوم سے کام لینے کی ایک شرط تھی جو افسوس کہ بعد کی نوکر شاہی پورا نہیں کر سکی۔

شرط یہ تھی کہ اس قوم کو ایک آزاد قوم سمجھا جائے اور اس کو وہ حقوق اور مراعات دی جائیں جن کی ایک آزاد قوم مستحق ہوتی ہے۔ اس پر اعتماد کیا جائے۔ اس کو بے گناہ رگڑ کر اس کی خود اعتمادی اور عزت نفس کو پامال نہ کیا جائے' آزادی سے جتنی امیدیں اس نے باندھ رکھی تھیں۔ ان کو پورا ہونے کا موقع دیا جائے' اس کو بے آبرو نہ کیا جائے' اس کی زندگی اس کے گھر کے اندر اس قدر مشکل نہ بنا دی جائے کہ اس کی باصلاحیت نئی نسل اپنا ملک چھوڑ کر محض روزگار کی تلاش میں اور آزادی کی ہوا سونگھنے کے لیے دوسرے ملکوں میں جا کر دھکے کھاتی پھرے۔

افسوس صد افسوس کہ قائدین کے اٹھ جانے اور غلام محمد مرحوم کے آتے ہی یہ انداز فکر باقی نہیں رہا۔

اوپر عرض ہو چکا ہے کہ قائدین کی رحلت کے بعد نوکر شاہی نے اپنا جال اس قدر پھیلایا' اس قدر نئے عہدے نکالے اور اس قدر شاہ خرچی کے پروگرام بنائے کہ ملکی ذرائع آمدنی ان کو پورا کرنے کے لیے ناکافی نظر آئے۔ پہلے طرح طرح کے ٹیکس لگائے گئے مگر پھر بھی خرچ پورا نہیں ہوا۔ مجبوراً نوکر شاہی کو تجویز سوجھی کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی امریکہ جیسے ہاتھ کے کھلے ملک کے پاس رہن رکھ کر اس کی امداد کے ذریعہ اپنی ضرورتیں پوری کی جائیں۔

چنانچہ بعد کا قصہ مرحوم غلام محمد کی اپنی زبانی سن لیجیے۔

1953ء کے آخر میں مرحوم سندھ کے دورے پر تشریف لے چلے۔ میں سندھ کا ریونیو وزیر تھا اور میری ڈیوٹی یہ لگی کہ میں ان کے ہمرکاب چلتا رہوں۔

لاڑکانہ پہنچے تو ایک شام موصوف نے مجھے بلا کر کہا کہ سر ظفر اللہ خان آج امریکہ سے ہو کر کراچی پہنچا ہے اور کل صبح کی گاڑی سے یہاں آ رہا ہے اس کے استقبال اور رہائش کا انتظام ہونا چاہیے۔ حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ صبح کو سر ظفر اللہ خان تشریف لے آئے۔

ہم سب اس روز ڈرگھ جھیل پر شکار کھیلنے کے لیے جا رہے تھے۔ شکار دیکھنے

اور تفریح کرنے کی غرض سے مرحوم غلام محمد بھی وہاں چلے اور ظفراللہ خان کو بھی ساتھ لے لیا۔

ڈرگھ جھیل کے کنارے شامیانے کے نیچے میں نے دیکھا کہ دونوں آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ سرگوشی کے انداز میں' میں نے ان کا فوٹو کھینچ لیا تھا جو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ کیا باتیں ہوئیں یہ پتہ اس روز نہیں چلا۔ سر ظفراللہ خان شام کو واپس چلے گئے۔

دو روز کے بعد گورنر جنرل کی منزل سکھر تھی۔ مرحوم غلام محمد اور ہم کشتی میں بیٹھ کر مرحوم پیرزادہ عبدالستار کی دعوت پر ان کی ''کیٹی'' کی طرف جا رہے تھے۔

اس وقت موصوف غیر معمولی انبساط کے موڈ میں تھے۔ سب کو اپنے پاس بلا کر علی الاعلان کہنے لگے: ''تم کو معلوم ہے کہ خدا نے کس طرح پاکستان کو بچالیا ہے؟ لیاقت علی کے مرنے کے بعد خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ ملازموں کی تنخواہوں کے لیے بھی پیسہ نہیں تھا۔ میں بھاگتا ہوا امریکہ گیا' وہاں بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اور انتہائی منت سماجت کر کے میں نے امریکہ کو رضامند کر لیا کہ وہ ہماری مالی مدد کرے۔ امداد کے عوض ہم کو ان کے ساتھ کچھ دوستی کے معاہدے کرنے پڑیں گے' جن کی تفصیل طے کرنے کے لیے ظفراللہ وہاں گیا ہوا تھا۔ خدا کے رحم و کرم سے اب سب باتیں طے ہو گئی ہیں۔''

اگلے چند مہینوں میں یہ معاہدے ہو گئے۔ معاہدے کیا تھے؟ سیٹو اور بغداد پیکٹ! دونوں کے تحت پاکستان نے اپنے کو کمیونزم سے لڑنے کا پابند بنا دیا۔

روس موقع کا منتظر رہا۔ حالات موافق نظر آئے تو اس نے ہندوستان کی پیٹھ ٹھونک کر اس کو آگے کر دیا اور مشرقی پاکستان کو ہم سے علیحدہ کروا دیا۔

یہ تو خدا نے خیر کی کہ یہ فقیر وقت پر چین پہنچ گیا تھا اور اندرون پاکستان غیر ملکی لابیوں کی شدید مزاحمت کے باوجود اس نے چین اور پاکستان کے تعلقات کا جو کافی بگڑے ہوئے تھے ٹھیک کروایا ورنہ کمیونزم والے ایشو پر اگر روس اور چین دونوں ہمارے دشمن بنے رہتے تو ہمارا کون پرسان حال ہوتا؟

آگے چل کر ہمیں سیٹو اور سینٹو (بغداد پیکٹ) دونوں سے جان چھڑا کر نہرو

اور ناصر کی قائم کردہ ''غیر وابستہ ملکوں کی تحریک'' والوں کے دروازہ پر دستک دینی پڑی۔ بیچ میں ہم خواہ مخواہ اپنا آدھا ملک گنوا کر بیٹھ گئے اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ نوکر شاہی کی شاہ خرچی کو پورا کرنے کے لیے ہم کو پیسے لے کر غلط معاہدے کرنے پڑے تھے۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ رہا کہ:

(1) قائداعظمؒ اور قائد ملتؒ کی استغنا اور خوداعتمادی پر مبنی آزادانہ پالیسیاں نوکر شاہی نے ملک پر قبضہ کرتے ہی ڈانوا ڈول کر دیں۔ (2) نوکر شاہی نے اپنی شاہ خرچیوں سے ملک کو مالی لحاظ سے مقیم کر دیا۔ (3) خسارہ کو پورا کرنے کے لیے ہم کو مقروض اور محتاج بننا پڑا۔ (گردن توڑ ٹیکس محصول اس کے علاوہ) (4) اس وجہ سے ہماری خارجہ پالیسی متاثر ہو کر اپنے ہی ملکی مفاد کے خلاف چلنے لگی۔

الغرض

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ

چین کی نوکر شاہی کی مثال

نوکر شاہی یا بیوروکریسی کا نظام دنیا کی تاریخ میں سب سے اوّل چین میں قائم ہوا۔ انگریز نے بھی اپنے مفتوحہ علاقوں کے لیے اس نظام کا تصور چین سے ہی لیا۔ اس نے اپنے گھر میں یہ نظام قائم نہیں کیا۔ محض اپنی نو آبادیوں کے لیے ہی مخصوص کر رکھا۔ نام اس نظام کا رکھا "سول سروس" حالانکہ بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم عمل کے لحاظ سے یہ نہ "سول" تھا نہ "سروس"! لارڈ جارج نے اس کو STEEL FRAME "فولادی ڈھانچے" سے تعبیر کیا۔ انگریز کا دو سو برس کا راج اسی کے بل بوتے پر چلا اور آخر میں غیر مقبول بھی اسی کی وجہ سے ہوا۔

اندرون چین نوکر شاہی نے جو کچھ کیا اس کی تفاصیل سے تاریخ چین لبریز ہے۔ یہ نظام تقریباً دو ہزار سال چلا اور اس طرح سے کہ ملک کبھی آرام اور خوشحالی سے ہمکنار نہیں ہو سکا۔ سارا وقت بادشاہ گردیاں' بغاوتیں' باہر سے یلغاریں' اندرون ملک قتل و غارت' قحط و بردہ فروشی' ملک بدری' نوکر شاہی کے ہاتھوں بے تحاشا لوٹ مار' محلاتی سازشیں' خودکشیاں' بچوں کو بیچنا' نوزائیدہ بچوں کو راستوں پر پھینک دینا' کبھی قحط کے زمانے میں بچوں کو مار کر ان کے گوشت پر زندہ رہنا' رہزنی' طاعون جیسی مصیبتیں اور قباحتیں چین کا مقدر بنی رہیں۔ ان ہولناک حالات میں جن کے دوران ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ مرتے رہے اور علاقوں کے علاقے قحط یا طاعون کی لپیٹ میں آکر خالی ہوتے رہے۔ اگر کوئی کلاس خوشحال' متمول اور بے فکر رہی تو وہ نوکر شاہی

کلاس تھی جس کو "منداریں" کہا جاتا تھا۔

میں جب چین پہنچا اور وہاں کی انقلابی قیادت کے ساتھ قدرے گہرائی پیدا ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون سی ترکیب تھی' جس سے انہوں نے صدیوں سے پسماندہ چین کو اس قدر جلد ایک طاقتور' خود کفیل اور باوقار ملک بنا دیا۔ یہ سوال میں نے ماؤزے تنگ اور چواین لائی دونوں سے کیا۔ اور دونوں کا جواب ایک ہی تھا۔

ان کا جواب تھا۔

"ہم نے اصل مرض کی تشخیص کر کے اس کا فوری علاج کر دیا۔ چین کا مرض اس کی بیوروکریسی (نوکر شاہی) تھی جو دو ہزار سال سے چین کے رگ و ریشہ میں گھسی ہوئی تھی اور اس کی قوت چوستی رہتی تھی۔ ہم نے شروع میں ہی اس کو ملیا میٹ کر کے عوام کی مرضی اور مزاج کے مطابق ملکی انتظام چلانے کے لیے متبادل طریقے نکال لیے جن سے عوام کی اجتماعی قوتوں اور پیدائشی صلاحیتوں کو بیوروکریسی کے مرض سے نجات پا کر اور صحت مند ہو کر ابھرنے کا موقع مل گیا۔ بیوروکریسی سے مراد روایتی چینی سول سروس تھی جس کو منداریں کلاس کہا جاتا تھا اور جو سارے ملک پر اس قدر چھائی رہی کہ اس کے سامنے وقت کے بادشاہ خود محض کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اکثر بادشاہوں کو تخت پر بٹھانا یا معزول کروانا' یا مار ڈالنا اس کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی طاقت کا فائدہ اٹھا کر اپنے گھر بھر دیئے تھے اور عوام کے گھر اجاڑ کر رکھ دیئے تھے۔ عوام بچے بیچ کر یا قلی کی زندگی اختیار کر کے ملک سے باہر جا کر زندہ رہنے کی کوشش کرتے تھے۔"

"نئے چین نے سب سے اوّل اس سے نوکر شاہی کی جڑ نکال دی اور تب ہی جا کر معاشرہ صاف اور صحت مند ہوا اور عوام کی تعمیری قوتیں پھر عود کر آئیں۔"

بیوروکریسی کی بیخ کنی کے مسئلہ میں نیا چین کس قدر سخت تھا' اس کی ایک مثال سن لیجئے۔

میں ہانگ کانگ سے بذریعہ ریل پیکنگ روانہ ہوا تو چین کی حدود کے اندر پہلا اسٹیشن کنٹان آیا۔ وہاں میرا سامان ایک گاڑی سے اتار کر دوسری میں رکھنا تھا۔ چینی پروٹوکول افسر اس کام میں قدرے تساہل برت رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں اس نے کو

طعنہ دیا کہ "تم سچے بیوروکریٹ معلوم ہوتے ہو' اس لیے تمہاری چال اس قدر ڈھیلی ڈھالی ہے۔" یہ جملہ سنتے ہی پروٹوکول افسر کا رنگ فق ہو گیا۔ پیشانی پر پسینہ آ گیا اور قریب قریب کانپنے لگ گیا۔ اس وقت تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کتنی سخت بات تھی جو میں نے اس چینی افسر کے بارے میں کہہ دی۔

میں نے اپنے سفارتخانہ کے چینی ترجمان سے پوچھا جو میرے استقبال کے لیے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ "چین میں بیوروکریٹ ہونا اور بیوروکریٹک مزاج دکھانا سخت جرم ہے۔ اگر اسی پروٹوکول افسر کے بارے میں اوپر والے سن لیں کہ ایک غیر ملکی سفیر کی نظر میں اس کی ذہنیت بیوروکریٹک ہے تو اس کو نہ صرف نوکری سے نکال دیں بلکہ اس کو قید کی سزا ہو جائے۔"

نئے چین میں سرکاری ملازموں سے کسی طرح عوام کی خدمت کرائی جاتی ہے یہ آپ غالباً اس چینی فلم میں دیکھ چکے ہیں جس کا ٹائٹل تھا "ننگے پاؤں ڈاکٹر"۔ اس فلم میں (جو امریکیوں نے تیار کی تھی) نظر آتا تھا کہ ایک ڈاکٹر دوائیں لیے دیہات میں پھر رہا ہے' جس کے پاؤں میں جوتی تک نہیں!

آپ اس کا مقابلہ اپنی نوکر شاہی کے مزاج سے کیجئے یہاں شروع زمانہ کے بیوروکریٹ روتے تھے کہ ان کے بیٹھنے کے لیے پیشگی کرسی ٹیبل کا انتظام نہیں کیا گیا تھا اور ان کو خالی بکسوں پر بیٹھ کر کام کرنا پڑتا تھا۔

کاش ہمارے یہ نازک مزاج اور آرام پسند افسر چین میں اگر ہوتے تو ان کو عوام کی خدمت کا ڈھنگ اچھی طرح سے سکھا دیا جاتا۔

میں نے وہاں چین کے آخری شہنشاہ پویی PUYI کو بحالت عزل مالی کا کام کرتے دیکھا۔

عام طور پر بڑے بڑے سرکاری افسران کو سال میں چند مہینے لازماً کھیتوں میں جا کر اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا کام کرنا پڑتا تھا' میں نے اپنی آنکھوں سے کئی مقتدر افسروں کو زمین کی کھدائی کرتے دیکھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے مزاج درست رہیں اور ان میں اور عوام میں یک رنگی' مساوات اور مماثلت قائم ہو۔

یہ ہے وہ چین جو قریب قریب ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا مگر اب ایٹم بم

بنائے بیٹھا ہے اور روس جیسی طاقت کو للکار رہا ہے۔ امریکہ جس کے پاؤں حاجت مند ممالک رات دن چاٹتے رہتے ہیں' اس کا صدر بذات خود اس کی خدمت میں حاضر ہونا اپنی زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھتا ہے اور ہر وقت فکرمند رہتا ہے کہ چین ناراض نہ ہو جائے!

میں نے دوران قیام چین کوشش کی کہ اس بات کا کھوج لگاؤں کہ چین کی نوکر شاہی نے اقتدار پر قبضہ کرنے اور وقت کے بادشاہوں کو شیشہ میں اتارنے کے لیے انقلاب سے پہلے کے زمانے میں کیا کیا طریقے اختیار کیے تھے۔

چین میں تقرری سے پہلے میں چین کے حالات سے بے خبر اور اس کی تاریخ سے قطعی ناآشنا رہا تھا۔ ایک آدھ کے سوا میں نے ان مضامین پر کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی' مگر اب مجھے جیسے ہی معلوم ہوا کہ میں چین جا رہا ہوں اور چین میں محض اسی سفیر کو اہمیت دی جاتی ہے جس کے بارے میں ان کو معلوم ہو کہ یہ شخص ان کی تاریخ سے واقف ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ چین پر جتنا مواد لائبریریوں یا ہانگ کانگ کے کتب فروشوں کے یہاں سے دستیاب ہو سکے پڑھ ڈالوں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ میں کئی راتیں بالکل سویا نہیں اور سارا وقت مطالعہ کرتا رہا اور نوٹ لیتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں چین پہنچا تو اس سے پہلے بہت کچھ اس کے ماضی اور حال کے بارے میں میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا اور میں اس قابل ہو گیا کہ چین کی تاریخ اور چینی لائف کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ بول سکوں۔ خود چینیوں کو کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی تھی اور اس وجہ سے وہ جب بھی مجھ سے گفتگو کرتے تھے' تو یہ سمجھ کر کہ یہ شخص چین کے متعلق پہلے سے ہر چیز جانتا ہے' نتیجتاً چینیوں کی روایتی شرافت' مہمان نوازی اور تہذیب تو اپنی جگہ' وہ اسی بنا پر خاص طور پر میری عزت کرنے لگے اور میری بات کو غیر معمولی اہمیت دیتے رہے کہ ان کے ملک سے مجھے دلی محبت ہے کیونکہ یہ بات ان کے تصور میں نہیں آ سکتی تھی کہ کوئی شخص بغیر ذاتی محبت اور قلبی لگاؤ کے چین کی تاریخ' لٹریچر' تہذیب اور تمدن کے اوپر اپنا دماغ اس قدر کھپا چکا ہو۔

اس مطالعہ کے دوران مجھے یہ معلوم ہوا کہ:

(1) چین کے عوامی انقلاب کی بنیاد ایک سیاستدان ڈاکٹر سن یات سن نے رکھی۔

(2) مگر جیسے ہی سن یات سن کا لایا ہوا انقلاب کامیاب ہوتا نظر آیا وہاں کی پرانی

نوکرشاہی نے یہ کوشش شروع کر دی کہ وہ آگے بڑھ کر انقلاب کا پھل خود کھالے۔ پہلے ایک مندارین یو آن شی کائی نامی اٹھا اور کچھ ہیرا پھیری کے بعد اس نےEMPROR (شہنشاہ) ہونے کا اعلان کر دیا مگر عوام میں اس کی نہیں چلی اور گھبرا کر مر گیا۔ اس کے بعد نوکرشاہی کے اکسانے پر فوجی اکیڈمی کا پرنسپل' چانگ کائی شیک میدان میں آیا اور طوائف الملوکی کا فائدہ اٹھا کر نوکرشاہی کی شرکت سے چین کا ڈکٹیٹر بن بیٹھا اور تقریباً پچیس تیس سال ملک کو اس طرح رگڑتا رہا کہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے چین کے عوام کیمونزم اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانہ میں موقع پا کر جاپان بھی چین میں گھس آیا اور ہر چند چانگ کائی شیک اس کا مقابلہ کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ چین کے عوام کا اعتماد اور تعاون اس کے اپنے چھوٹے پن اور اس کی نوکرشاہی کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے اس کو حاصل نہیں ہو سکا۔ چین کے عوام من حیث القوم کیوں اور کس طرح کیمونسٹ بنے' اس کے بارے میں میری بیوی نے خود آنجہانی ماؤزے تنگ سے ایک مرتبہ پوچھا کہ: "آپ کب اور کیسے کیمونسٹ بنے؟" اس کا جواب تھا: "ہم کیمونسٹ پیدا نہیں ہوئے تھے' ملک کے حالات نے بعد میں ہم کو مجبور کر دیا۔ شروع میں ہم صرف بارہ تیرہ لڑکے تھے جن کے پیچھے نوکرشاہی نے ہر وقت پولیس لگا رکھی تھی اور میٹنگ کرنے کے لیے ہم کو زمین پر کوئی جگہ نہیں ملی تو ہم کشتی میں بیٹھ کر چلتے بھی رہے اور اپنا انقلابی پروگرام بھی بناتے رہے...... یہ بارہ تیرہ لڑکے! ان میں سے بھی اکثر بعد میں مارے گئے یا مر گئے۔ ایک آدھ بے وفا نکلا' باقی دو تین رہ گئے جنہوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔"

(3) چین کا یہ انقلاب اس لحاظ سے سبق آموز رہا کہ اس نے واضح کر دیا کہ عوام کے تعاون سے' اعتماد اور شرکت کے بغیر محض مزدور پیشہ فوج اسلحہ کے زور پر کسی محاذ پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ چانگ کائی شیک کا مدار نوکرشاہی اور تنخواہ بردار فوج پر تھا۔ ماؤزے تنگ والوں کا مدار بے ہتھیار دیہاتی عوام

پر تھا۔ چانگ کائی شیک ناکام ہوا اور جان بچا کر چین سے بھاگ نکلا۔ ماؤزے تنگ کامیاب ہوا اور عوام کی مدد اور ان کے تعاون سے چین کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ تنخواہ سے زیادہ دل لڑتا ہے' عوامی طاقت کے مقابلے میں تنخواہ اور اسلحہ کسی کام کے نہیں۔ یہی حقیقت اسی دور میں دنیا کے دوسرے محاذوں پر بھی منکشف ہوئی' مثلاً اسٹالن گراڈ کو کس نے بچایا؟ دوسری عالمی جنگ' جو اسی دور میں لڑی گئی۔ کس نے جیتی؟ جمہوری عوام قوتوں نے یا ہٹلر کی فوج نے؟ فی الحقیقت یہ راز پہلی بار چین میں کھلا کہ فوج کی نسبت عوام زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ اگر عوام کا تعاون حاصل نہیں تو فوج تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔

(4) انقلاب چین سے پہلے کے دور میں اقتدار نوکرشاہی کے ہاتھوں میں رہا۔ بادشاہ صرف نام کے ہوتے تھے۔ نوکرشاہی نے ان کو اس قدر ڈرا رکھا تھا کہ وہ بے چارے' اپنے عوام سے دور' ہر وقت محل میں بند رہتے تھے جس بادشاہ نے دیوار چین بنائی وہ ہر رات' شب خون کے ڈر کا مارا' مختلف جگہوں پر سوتا تھا۔ اپنے چھپنے کے لیے اس نے ایک وسیع اراضی پر ایک سو سے زیادہ چبوترے بنوا رکھے تھے۔ جو بادشاہ نوکرشاہی کی مرضی پر نہیں چلتا تھا اس کو کسی نہ کسی طرح ختم کرا دیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کو احمق بنانے کے لیے نوکرشاہی نے ان کے دماغ میں یہ وہم بھر رکھا تھا کہ وہ عوام کی منشا سے بادشاہ نہیں بنے ہیں' وہ براہِ راست آسمان کے منتخب کردہ ہیں اور آسمانی ارشادHEAVENLY MANDATE کے تحت حکمرانی کر رہے ہیں۔ خدا کا تصور چین میں نہیں تھا۔ انہوں نے خدا کی جگہ (نعوذ باللہ) آسمان کو دے رکھی تھی۔ اس لیے ہر حرکت کا جوڑ آسمان سے ملا دیا جاتا تھا۔ اگر کسی پاگل حکمران کے دماغ میں یہ بھوت سوار ہو جائے کہ اسی پر آسمان کا سایہ ہے اور وہ جو کام کر رہا ہے' اس کی نگرانی اور تائید خود آسمان کر رہا ہے تو وہ کس طرح عوام سے متعلق اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا یا وقت کے تقاضوں کا خیال رکھے گا؟ منگ خاندان کے آخری بادشاہ نے اس وجہ سے اپنے کو

درخت سے لٹکا کر خودکشی کر لی کہ باغی محلاتیوں یعنی نوکر شاہی کے آدمیوں نے اس سے کہہ دیا کہ اس کا HEAVENLY MANDATE اب ختم ہو گیا ہے! نوکر شاہی نے یہ مشورہ اس کو اس وجہ سے دیا کہ اس نے (یعنی نوکر شاہی) ایک حملہ آور نئی طاقت سے پہلے سے ساز باز کر رکھی تھی۔
مجموعی طور پر وہاں کی نوکر شاہی کا کردار یہ رہا کہ اس نے بادشاہوں کو ایک غیر حقیقی دنیا میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بادشاہ محل کے اندر بند اپنی لغویات میں لگے رہتے تھے۔ باہر کی دنیا کی ان کو کوئی خبر نہیں رہتی تھی۔ ملکی نظم و نسق پر کاملاً نوکر شاہی کا کنٹرول رہتا تھا جو عوام کا خون چوستی رہتی تھی۔ کبھی کبھی عوامی "بغاوتیں" ہو جاتی تھیں یا کوئی باہر کا غنیم حملہ آور ہوتا تھا تو نوکر شاہی فوراً اس سے مل جاتی تھی اور اپنی پوزیشن محفوظ کر کے اور اس نئے حکمران کو بھی اپنے گھیرے میں لے کر اس کے نام سے حکم چلانے لگتی تھی۔ حقیقی وفاداری اس کی کسی بادشاہ سے نہیں ہوتی تھی۔ اگر کسی سے وفاداری تھی تو اپنے پیٹ سے اور اپنی کلاس سے' بادشاہ کوئی آئے یا جائے' اس کی بلا سے! اس کو فکر صرف اپنے کلاس کے استحکام اور اس کی گرفت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی ہی رہتی تھی۔

(5) بادشاہوں کو عوام سے دور رکھنے کی غرض سے چین کی نوکر شاہی نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار یہ فلسفہ نکالا کہ دارالحکومت' یعنی حکمرانوں کی بستی' علیحدہ ہونی چاہیے' جہاں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سننے میں نہ آئیں اور نوکر شاہی کو سہولت رہے کہ وہ جس طرح چاہے وقت کے بادشاہ کو بیوقوف بناتی رہے اور عوام' بوجہ دوری' نوکر شاہی کے بُرے کرتب دیکھ نہ سکے۔ اسی تخیل کے تحت انہوں نے پیکنگ کے ایک علاقے کے چاروں طرف حصار کھنچوا کر اس کو "ممنوعہ علاقہ" یا ممنوعہ محل FORBIDDEN PALACE قرار دے کر بادشاہ کو اس کے اندر بند رکھا اور یہی اپنا بھی گڑھ بنا لیا۔ بادشاہ کے سامنے اپنی حاضری' یا گزارش کے ٹائم ایسے مقرر کروائے کہ اس وقت پیکنگ کے انسان تو کجا' چرند اور پرند بھی سوتے رہتے تھے۔ یعنی

طلوع آفتاب سے چند گھنٹے پہلے! پیکنگ کا موسم اور یہ اوقات حکمرانی! پھر اگر کبھی بادشاہ کو ایک محل سے نکل کر دوسرے کی طرف جانا ہوتا تھا تو سپاہیوں اور پبلک کے لیے حکم تھا کہ وہ شاہی جلوس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہوں اور شاہی سواری کی طرف نہ دیکھیں۔
یہ فلسفہ کہ دارالحکومت عوام سے دور اور بالکل علیحدہ ہونا چاہیے تاکہ نوکر شاہی عوام کی نظروں سے اوجھل اور پردوں اور پہروں کے پیچھے رہ کر جو چاہے کرتی رہے۔ چین سے چلا اور اس کی نقالی فرانس' روس اور یورپ کی بعض دوسری ریاستوں نے کی۔ فرانس نے پیرس سے دور ورسائے بنایا۔ روس نے پیٹر سبرگ سے دور زار سکو سیلو بسایا۔ یہ نئی علیحدہ اور عوام کے شوروشر سے دور شاہی بستیاں تھیں جہاں بادشاہ اور ان کے وزراء امراء رہتے تھے۔ عوام کو وہاں سے گزرنے کی بھی اجازت نہیں تھی مگر ایک وقت آیا جب یہ سودا خود بستیوں کو بنانے والوں کے حق میں مہنگا ثابت ہوا۔ فرانس' روس' چین سب میں انقلاب آئے اور ان علیحدہ بستیوں میں رہنے اور عوام سے مغائرت برتنے والے بادشاہوں اور ان کے درباریوں کو ختم' اور خود بستیوں کو ویران کر دیا گیا۔ یہ نتیجہ تھا عوام سے دور نوکر شاہی کی قلعہ بندی کا۔ آج وہاں محض عجائب گھر ہیں۔ عوام کے دیکھنے اور دنیا کی علیحدگی پسند نوکر شاہی کے لیے عبرت لینے کے لیے!!

(6) نوکر شاہی کس قدر سخت جان ہوتی ہے' اس کی نشاندہی بھی چین کی تاریخ سے ہوتی تھی۔ مثلاً چین میں یہ قانون تھا کہ اگر نوکر شاہی کا کوئی دوسرا آدمی رشوت خوری' خیانت یا بدعنوانی کی وجہ سے حد سے زیادہ بدنام ہو جائے' تو نہ صرف اس کی اپنی گردن اڑا دی جاتی تھی بلکہ اس کے سارے کنبے کو بیک وقت ذبح کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کے خاندان کی جملہ جائیداد بحق سرکار ضبط ہو جاتی تھی۔ مگر ان سزاؤں کے باوجود (جن کو وہ ایکسیڈنٹ سمجھتی تھی) نوکر شاہی پھیلتی پھولتی رہی اور جب تک عوامی انقلاب نے آ کر اس کو خس و خاشاک کی طرح اڑا نہیں دیا۔ اس نے اپنا طرز نہیں بدلا۔

(7) نوکر شاہی کی بداعمالیوں کی وجہ سے عوام اس قدر مایوس اور بددل ہو گئے کہ ان کو خود اپنے ملک سے دلچسپی اور وفاداری نہیں رہی اور ملک ٹوٹنے لگا۔ منگولیا گیا' مینچوریا گیا' تبت گیا' کوریا گیا' فارموسا گیا' ساحلی شہر قرض اور تاوان جنگ کے عوض یورپی طاقتوں کے قبضے میں چلے گئے۔ ریلوے اور کسٹم کی آمدنی سب باہر والوں کے حوالے ہو گئی۔ اور بالآخر چین کے اکثر علاقوں پر جاپانی چھا گئے اور چانگ کائی شیک بہ انداز ڈکٹیٹر' اپنی فوج اور امریکہ سے آئے ہوئے اسلحہ کو لیے دربدر خاک بسر خواہ مخواہ انسانی خون ضائع کرتا ادھر ادھر بھاگتا پھرتا رہا۔ وہ عوام کا دشمن اور عوام اس کے دشمن تھے۔ بالآخر چین کی زمین اس پر تنگ ہو گئی اور اس کو فارموسا میں جا کر دم لینا پڑا۔ چین پر عوامی طاقت کا قبضہ ہو گیا اور اس نے اگلے پچھلے سارے حساب سب سے چکا لیے!

(8) نوکر شاہی نے اپنے دور میں اس بات پر خاص زور دیا کہ عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے کنفیوشس کی تعلیمات کو' جن کو کسی زمانہ میں مذہب کی سی سیاسی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ عام کیا جائے اور زبردستی لوگوں کو ان پر چلنے پر مجبور کیا جائے۔ کنفیوشس کی تعلیمات کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ ملکی عوام کو وقت کے حکمران سے وفاداری دکھانی چاہیے اور اس کو فوق الفطرت یا آسمانی نمائندہ سمجھ کر اس کی غیر مشروط تابعداری کرنی چاہیے۔ کنفیوشس غریب کو اس حد تک ایکسپلائٹ کیا گیا اور سیاسی معاملات میں گھسیٹا گیا کہ لوگ خود کنفیوشس سے بیزار ہو کر اس سے جان چھڑانے کے لیے 'کمیونزم میں داخل ہو گئے۔ چین میں آج کنفیوشس کو کوئی پوچھتا بھی نہیں' یہ ردعمل تھا اس کی تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کو جھٹلانے کے لیے بے جا استعمال کی کوششوں کا!

(9) نوکر شاہی کن کن عیارانہ طریقوں سے وقت کے حکمرانوں پر اپنا اعتبار جما کر اس سے غلط کام کرواتی تھی اور آخر میں اس کو خوار و خراب کر کے چھوڑ دیتی تھی' یہ دلچسپ بلکہ حیرت انگیز واقعات بھی چین کی تاریخ میں کثرت سے

نظر آئے۔

(10) اور پھر چینی نوکر شاہی کی لوٹ مار' رشوت خوری' اور عوام آزادی کے قصے؟ انسان پڑھ کر خدا سے پناہ مانگتا ہے کہ کسی قوم پر یہ افتاد نہ آئے۔

ہمارے لوگ چین جاتے ہیں۔ وہاں کی مہمان نوازیوں سے مستفید ہو کر اور چند سطحی چیزیں دیکھ کر لوٹ آتے ہیں اور اپنی کامرانیوں کے قصے کہانیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگ جاتے ہیں مگر یہ حضرات چین کی تاریخ اور چین کے مزاج تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے' ورنہ ان کو وہاں کئی ایک سبق آموز چیزیں نظر آ جائیں۔

نوکرشاہی نے منظّم سیاسی زندگی کو عمداً برباد کیا

پاکستان بنتے اور قائدین کی رحلت واقع ہوتے ہی، دو قوتوں کے مابین مقابلہ شروع ہوگیا۔ ایک طرف عوام دوسری طرف نوکرشاہی۔

پاکستان بنا تھا، عوام کے ووٹ سے اور سلطانی جمہور کے اصول پر مگر نوکرشاہی نے یہ عزم کرلیا کہ وہ اپنی ہی سلطانی قائم کرے گی اور عوام کو عملاً اقتدار سے محروم رکھے گی۔ اس وجہ سے نوکرشاہی اور عوام ایک دوسرے کے حریف یا رقیب بن گئے۔

اب عوام کے اقتدار میں آنے کا ذریعہ صرف سیاسی پارٹیاں اور منظم سیاسی جماعتیں ہی ہوسکتی تھیں مگر یہ بات نوکرشاہی کے عزائم کے خلاف جا رہی تھی، لہٰذا نوکرشاہی کی یہ کوشش رہی کہ سیاسی پارٹیاں اور جماعتیں ابھرنے نہ پائیں بلکہ منتشر ہو کر کالعدم ہوجائیں۔

پس نوکرشاہی کی پہلی ضرب مسلم لیگ پر پڑی جو اس وقت سب سے بڑی پارٹی تھی، اور قائداعظمؒ سے وابستگی کی وجہ سے اس کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔

نوکرشاہی نے تین راؤنڈ کے اندر اس کو ختم کرکے رکھ دیا۔

قارئین کرام یہ بنیادی نکتہ ذہن میں رکھ کر اب آگے آنے والا مواد ملاحظہ فرمائیں۔

جس طرح پہلے کی اقساط میں عرض ہوچکا ہے نوکرشاہی نے، مرحوم غلام محمد

کے زمانے میں، اقتدار پر قبضہ کرتے ہی قائداعظمؒ کے اصولوں کو پامال کرنا شروع کردیا۔

مثلاً قائد کی سیاسی زندگی کا ایک اصول یہ تھا کہ مسلمانوں کی سیاست منظم ہو، منتشر اور غیر مربوط نہ ہو یعنی سیاسی پارٹیاں ہوں جن کی جڑیں عوام میں ہوں۔ یہ پارٹیاں انتخابات میں اپنی ذمہ داری پر اپنے نمائندے منتخب کروائیں اور ان نمائندوں پر اپنا کنٹرول رکھیں تاکہ جن پارٹی منشوروں کی بنیاد پر وہ عوام سے ووٹ حاصل کرچکے ہیں ان سے منحرف نہ ہوپائیں۔

یہ بات قائد کے اصولوں کے سراسر خلاف تھی کہ ملک میں سیاسی تنظیمیں نہ ہوں اور بہ وقت انتخاب ہر حلقہ سے ایک ایسا آدمی منتخب ہو کر آئے جس پر کوئی پارٹی کنٹرول نہ ہو اور وہ شتر بے مہار بن کر، اپنی ذمہ داری پارٹی کے ذریعے عوام سے نہیں مگر خاص اپنی ذات سے سمجھے اور کسی نہ کسی طالع آزما کا چمچہ بن کر قوم کے اجتماعی فکر کو جھٹلاتا پھرے۔

بالفاظ دیگر یہ مضحکہ انگیز صورتحال قائد کے تصور سے قطعاً بعید تھی کہ سیاسی زندگی کی بنیاد انفرادی نفسا نفسی پر ہو۔

کس کو معلوم نہیں کہ وہ قائداعظمؒ ہوتے ہوئے بھی اپنے کو اپنی جماعت کے ڈسپلن کے تحت رکھتے تھے۔ جماعت سے پوچھے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتے تھے اور اپنی جماعت کے ٹکٹ پر ہی منتخب ہو کر آتے تھے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کا ریکارڈ موجود ہے۔ یہ کہیں نظر نہیں آئے گا کہ انہوں نے شتر بے مہار والی شخصی سیاست کے حق میں کبھی ایک لفظ بھی بولا ہو۔

اور یہی قائد کا اصول تھا۔ جس کو یہاں کی نوکرشاہی نے اٹھتے ہی پامال کردینا اپنے مستقبل کے عزائم کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا۔

اس زمانہ میں چونکہ مسلم لیگ ہی ایک ایسی پارٹی تھی جس کا عمل دخل کسی قدر حکومت میں بھی تھا، تو سب سے پہلے نوکرشاہی نے اس کی چولیں ڈھیلی کردیں اور اس کا ڈسپلن خراب کرنا شروع کردیا۔

اب اس کے پہلے راؤنڈ کا حال سنیے۔

(1) مرحوم غلام محمد گورنر جنرل بنے مگر مسلم لیگ پارٹی سے پوچھا تک نہیں۔

(2) انہوں نے مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر خواجہ ناظم الدین مرحوم کو اوپر ہی اوپر پرائم منسٹری سے ڈسمس کر دیا اور مسلم لیگ پارٹی کو موجود ہی نہیں سمجھا۔

(3) بوگرہ مرحوم کو امریکہ سے بلا کر براہِ راست پرائم منسٹر بنا دیا اور اس سے پہلی چچوں کی وزارت بنوائی تو بھی مسلم لیگ پارٹی سے منظوری نہیں لی۔

آپ پوچھیں گے کہ جب مرحوم غلام محمد یہ آمرانہ کارگزاریاں کر رہا تھا تو مسلم لیگ خود نے' جس کے حقوق پر ڈاکے پڑ رہے تھے' کیوں نہیں آگے بڑھ کر ان غیر آئینی حرکتوں کی مزاحمت کی؟

جواباً عرض ہے کہ شروع ہی کے دو تین سال کے اندر نوکر شاہی کے ہاتھوں مسلم لیگ کی اس قدر پٹائی ہو چکی تھی کہ اس میں کوئی جان یا قوت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے جاندار لیڈروں کو چن چن کر پروڈا وغیرہ کے ذریعے ذلیل کر کے سیاسی میدان سے دھکیل کر باہر کر دیا گیا تھا۔

چند ایک نوجوان جو تحریک کے ذریعے تازہ تازہ آگے آئے ہوئے تھے' ان سب پر "پاکستان دشمن" اور "غدار" کا لیبل لگا کر ان کے پیچھے سرکاری اخبار لگا دیئے گئے تھے تاکہ وہ ان کو بدنام کرتے رہیں۔

رہے عوام تو ان کا یہ موڈ بننے لگا کہ "جب ہم تک کوئی آتا نہیں' ہم سے کوئی پوچھتا نہیں تو جائیں اوپر والے سب جہنم میں۔ ما را ازیں چہ قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت؟" آزادی ابھی ابھی ملی تھی۔ عوام اپنے کو ہنوز نئے حالات سے "ایڈجسٹ" نہیں کر سکے تھے' ان کو "لیڈ" دینے والے دونوں قائد یکے بعد دیگرے دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ اب نئی دنیا' نئے لوگوں اور نئے مسائل سے ان کا سابقہ پڑا تھا۔ اخبارات کا کردار بھی ایسا نہیں رہا تھا کہ ان کی تحریروں سے عوام کی کچھ رہنمائی ہو۔ بنابریں سارا ملک شہرِ خموشاں تھا اور عوام سکتہ میں۔

نہ صرف یہ بلکہ اسی زمانہ میں ان کو پہلی بار (پنجاب میں) مارشل لاء کے جلوے بھی دکھا دیئے گئے تھے اور وہاں کے جرنیل صاحب نے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور دو چار اور قومی رہنماؤں کو پھانسی کی سزائیں سنوا رکھی تھیں۔ یہ سزائیں بعد میں

تو معاف کر دی گئیں مگر نوکر شاہی نے دکھلا دیا تھا کہ اس کھیل اور اس دور میں "یہ بھی ہو سکتا ہے" (اسی مارشل لاء کے دوران میں پنجاب کے لیگی چیف منسٹر سے بھی زبردستی استعفیٰ دلوا دیا گیا تھا۔)

پس انصاف کیجئے ایسے طوفان سے مسلم لیگ کہاں نمٹ سکتی تھی؟ مجبوراً

ناسزائے را چو گردد بخت یار
عاقلاں تسلیم کردند اختیار

دوسرا راؤنڈ' مرحوم غلام محمد کا' 1954ء میں شروع ہوا۔

موصوف نے پرائم منسٹر بوگرہ مرحوم کو چوہدری محمد علی مرحوم اور ایوب خان کی موجودگی میں آدھی رات کو پستول دکھا کر اور برا بھلا کہہ کر' اس سے آئین ساز اسمبلی کو تڑوا دیا اور چیف جسٹس منیر مرحوم سے' بقول ان کے' بعد میں اس فعل کے جواز میں سیاسی فیصلہ بھی صادر کروایا۔

آئین ساز اسمبلی کے صدر مرحوم مولوی تمیز الدین خان کچھ عرصہ لاحاصل مقدمہ بازی کرنے کے بعد مایوس ہو کر ڈھاکہ چلے گئے اور ایسے گئے کہ پھر کبھی مغربی پاکستان کا رخ نہیں کیا۔

یہ سب حوادث مسلم لیگ تنظیم کو پیش آئے اور وہ رفتہ رفتہ بے اثر اور بے وقار ہوتی گئی۔

پھر تیسرا راؤنڈ ہوا۔ اس موقع پر نوکر شاہی کی ٹیم کے کپتان بادشاہ بخیر مرحوم اسکندر مرزا تھے۔

یہ آخری راؤنڈ تھا جس میں یہ لوگ مسلم لیگ تنظیم کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔

23 مارچ 1956ء کو اسکندر مرزا نے صدر کا حلف اٹھایا اور چار روز کے اندر مخفی طور پر یہ منصوبہ بنایا کہ لاہور میں میٹنگ ہو جہاں ایسا کھیل کھیلا جائے کہ مسلم لیگ تتر بتر ہو جائے اور ری پبلکن کے نام سے چچوں کی ایک نئی "پارٹی" بنے جس سے نوکر شاہی کے مقاصد کو آگے بڑھانے کا کام لیا جائے۔

اس وقت کے حالات یہ تھے۔ مرکز میں چوہدری محمد علی مرحوم کی وزارت تھی

جس میں سندھ کی طرف سے میں اور مہاجروں کی طرف سے مرحوم چندریگر وزیر تھے۔ ویسے ساری وزارت پر نام کی خاطر مسلم لیگ کا لیبل لگا ہوا تھا اور مغربی پاکستان میں چند مہینے پہلے ون یونٹ بن چکا تھا اور اس کا عارضی چیف منسٹر ڈاکٹر خان صاحب مرحوم کو بنا دیا گیا تھا۔ گورنری کے منصب پر نواب گورمانی مرحوم فائز تھا۔ آئین کے نفاذ کے بعد مستقل چیف منسٹر کا انتخاب ازسرنو ہونا تھا۔ آئین مارچ 1956ء میں آ چکا تھا اور اب چیف منسٹر کا انتخاب عنقریب ہونا تھا۔

مرکز میں اب تک یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ جو شخص پرائم منسٹر ہو وہی مسلم لیگ کا صدر بھی ہو مگر نئے آئین کے پیش نظر' چندریگر مرحوم اور میں نے چودھری محمد علی مرحوم پر زور ڈالا کہ یہ روایت اب ختم ہو جانی چاہیے اور مسلم لیگ کا صدر کسی غیر وزیر کو بنا دینا چاہیے تاکہ لیگ کا عوام سے رابطہ پھر بحال ہو جائے۔ یہی خیال کابینہ سے باہر مسلم لیگ پارٹی کا بھی تھا۔ اس تحریک کے روح رواں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ' محترم چودھری محمد حسین چٹھہ اور خان بہادر کھوڑو مرحوم وغیرہ تھے۔ ان کا بھی اصرار تھا کہ وقت آ گیا ہے کہ مسلم لیگ جماعت کو حکومتی گروپ کی گرفت سے آزاد کروا دیا جائے۔

آخر اس اندر اور باہر کے دباؤ کی وجہ سے چودھری محمد علی مرحوم کے سامنے اب دو راستے رہ گئے ہیں یعنی وہ پرائم منسٹر رہیں یا مسلم لیگ کے صدر' چودھری صاحب مرحوم نے اپنے لیے پرائم منسٹری کو ترجیح دیتے ہوئے مسلم لیگ کی صدارت سردار عبدالرب نشتر مرحوم کی طرف منتقل کر دی۔

چودھری صاحب اور نوکر شاہی گروپ کا خیال تھا کہ سردار نشتر مرحوم کی طبیعت میں' حوادث زمانہ کی وجہ سے 'اب پہلا سا جوش و خروش اور پرانے اعلیٰ اصولوں سے لگاؤ نہیں رہا ہو گا اور وہ مصلحتاً اب وقت کی حکومت سے ہر کام میں ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد نوکر شاہی نے سردار صاحب کو پاکستان کی سیاست سے بے دخل کر کے اس حال کو پہنچا دیا تھا کہ وہ کراچی کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت میں آفس کھول کر تھوڑی بہت وکالت کرنے لگے تھے۔

مگر اب مسلم لیگ کے صدر بن جانے کے بعد سردار صاحب پھر مسلم لیگ

کو قائداعظمؒ والے جمہوری اصولوں پر چلانے لگے۔ اور یہ بات نوکر شاہی کی توقعات کے خلاف نکلی۔

سردار صاحب قائداعظمؒ کے قریبی ساتھی رہ چکے تھے اور جمہوری سیاست کا سبق انہیں سے سیکھے ہوئے تھے۔ وہ یہ سبق بھول کر آخر عمر میں کس طرح نوکر شاہی کا چمچہ بن سکتے تھے؟

ان کا نوکر شاہی یعنی اسکندر مرزا مرحوم اور چودھری محمد علی مرحوم سے پہلا ٹکراؤ ڈاکٹر خان صاحب کے سوال پر ہونا تھا۔ سردار صاحب کا موقف تھا کہ مغربی پاکستان کا مستقل چیف منسٹر کسی مسلم لیگی کو بنانا چاہیے کیونکہ اسمبلی میں اکثریت اسی پارٹی کی تھی۔ مقابلتاً اسکندر مرزا والے پہلے سے ڈاکٹر خان صاحب سے کمٹ تھے۔ ڈاکٹر مرحوم نے مسلم لیگ میں شامل ہو جانے سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ لاہور میں مسلم لیگ پارٹی کی میٹنگ اب اسی معاملہ کو صاف کرنے کے لیے ہونے والی تھی۔ اسکندر مرزا والوں نے طے کیا ہوا تھا کہ چونکہ سردار نشتر ڈاکٹر خان صاحب کو قبول نہیں کرے گا لہٰذا اسی موقع کو استعمال کر کے سردار نشتر کے غبارہ سے ہوا نکال دی جائے اور مسلم لیگ کو تڑوا کر قائداعظمؒ والی بااصول سیاست سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

مرزا صاحب والوں کی سازش کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ لاہور والی فیصلہ کن میٹنگ کے موقع پر ہر حال میں مجھ جیسے شعلہ مزاج مسلم لیگی کو ملک سے باہر رکھا جائے تاکہ میں دوڑ بھاگ کر کے ان کے منصوبے میں خلل نہ ڈال سکوں۔

اپنے لاہور والے منصوبے کو انتہائی راز میں رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے بغداد بھیجنے کا انتظام کر لیا۔ عام طور سے میں حکومتی وفدوں کے ساتھ باہر جانے سے گریز کرتا رہا تھا اور بغداد جانے کے لیے کابینہ نے ایک دوسرے وزیر محترم حبیب اللہ کو چنا ہوا تھا مگر جس روز بغداد میں پہلی تقریب ہونی تھی' اس سے اگلی شام وزیراعظم چودھری محمد علی نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا کہ حبیب کی جگہ' میں اسی شام بغداد چلا جاؤں کیونکہ کسی وجہ سے حبیب جانے سے معذور ہے۔ انہوں نے کچھ اس طرح سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔

البتہ میں چودھری صاحب کی اس فرمائش کے مضمرات تاڑ نہیں سکا اور مجبوراً

اسی رات بغداد روانہ ہو گیا۔ غالباً یہ انتظام اسکندر مرزا کے پلان کے تحت ہوا اور انہوں نے ہی چودھری محمد علی سے یہ کام لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اگر مجھے یہ شک گزرتا کہ مجھے ناگہاں باہر بھیجنے کا محرک اسکندر مرزا ہے اور اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ مجھے لاہور والی میٹنگ سے دور رکھا جائے' تو میں ہرگز باہر جانا قبول نہیں کرتا۔ ہو سکتا تھا کہ میں حاضر رہ کر بھی حالات کا رخ نہ بدل سکتا کیونکہ دوسری طرف صدر مملکت اور دوسری مقتدر ہستیاں کام کر رہی تھیں اور مقابلتاً میں محض ایک مرکزی وزیر تھا۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ میں کچھ کوشش اور کچھ واویلا کر کے ان کے رنگ میں کسی قدر بھنگ ڈال دیتا اور اسی چیز سے وہ غالباً بچنا چاہتے تھے اور مجھے باہر بھیجنے کا اضافی منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے میں ان کے جال میں پھنس گیا۔

سچ پوچھئے تو یہ ہمارا "دور جاہلیت" تھا۔ نوکر شاہی کی نئی گھاتوں کا تجربہ نہیں تھا۔ اب تک کچھ دھوکے ضرور کھائے ہوئے تھے مگر پھر بھی پورے طور سے ہماری آنکھیں ابھی نہیں کھلی تھیں۔ ہم قائد اعظمؒ والے دور کے کارکن تھے۔ اس دور میں "یہ کجا سے نمائی کجا سے نلی" والی سیاست نہیں ہوتی تھی۔ ہم اب بھی یہ سمجھتے رہتے تھے کہ یہ لوگ جو قائدین کی مسندوں پر بیٹھ گئے ہیں' وہ بھی ان کی طرح سیدھی' صاف اور ستھری سیاست کے ہی قائل ہوں گے مگر ہمارا یہ خیال غلط نکلا۔

قصہ مختصر میں بغداد چلا گیا اور اسکندر مرزا والے اپنے پروگرام کے مطابق لاہور پہنچ کر "کار دیگر" میں لگ گئے۔

ابھی چار پانچ روز گزرے تھے کہ ایک رات مرحوم مغفور شعیب قریشی جو بغداد میں پاکستان کے سفیر تھے' میرے پاس ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ:

"غضب ہو گیا' قائد اعظمؒ کی رہی سہی امانت پر بھی ڈاکہ پڑ گیا۔ ابھی ابھی ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ لاہور میں میٹنگ ہوئی اور اس میں مسلم لیگ کا شیرازہ بکھر گیا۔ کچھ لوگوں نے مسلم لیگ سے کٹ کر اپنے اوپر ایک نئی ری پبلکن پارٹی کا لیبل لگا کر ون یونٹ وزارت کی دعوت حاصل کر لی ہے۔ ریڈیو کی خبروں سے مزید یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس موقع پر اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی صاحب بھی لاہور میں تھے۔"

شعیب مرحوم مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے داماد' پرانے قومی لیڈر اور مسلم لیگ کے شیدائی تھے۔ اس خبر سے جو ان کو رنج پہنچا تھا' وہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔

میں نے اسی گھڑی چودھری محمد علی مرحوم کے نام ایک ارجنٹ تار بھیجا کہ

"مجھے فوراً بغداد سے واپس آنے کی اجازت دی جائے کیونکہ لاہور میں جو کچھ ہو چکا ہے' وہ بہت ہی برا ہوا ہے اور میں واپس آ کر پیدا شدہ صورت حال کی کچھ اصلاح کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

صبح تک ان کا جواب بھی آ گیا کہ میں اطمینان سے وہاں رہ کر پروگرام ختم کر لوں لیگ والے معاملے کی اصلاح کا بندوبست وہ خود کر رہے ہیں۔

ہفتہ کے بعد میں پروگرام ختم کر کے واپس آیا۔ ہوائی اڈے پر اسکندر مرزا کا ایلچی موجود تھا۔ جو مجھے سیدھا ان کے یہاں لے گیا۔ مرزا نے یہ فرمایا:

"سردار نشتر کی ضد کی وجہ سے اب مسلم لیگ ٹوٹ کر ختم ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک نئی پارٹی ری پبلکن کے نام سے وجود میں آ گئی ہے اور مغربی پاکستان کی حکومت اس کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اس نئی پارٹی کا نام اس وجہ سے ری پبلکن رکھا گیا ہے کہ اس وقت امریکہ میں بھی ری پبلکن پارٹی کا راج ہے اور اس نسبت کے باعث اس کو امریکہ کی حمایت بھی حاصل رہے گی۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کیا کرو گے؟"

میں نے کہا' میں ابھی ابھی آیا ہوں حالات کا پتہ لگا کر کل صبح آپ کو بتلاؤں گا کہ میں کیا کروں گا۔

دوسرے روز میں نے ان کو بتا دیا کہ میں مسلم لیگ میں ہی رہوں گا اور ہر طرح سے اس کی خدمت کروں گا۔ جو کچھ لاہور میں ہوا ہے وہ بہت ہی برا ہوا ہے' اس کی بنیاد صریحاً کوتاہ اندیشی پر ہے۔

اس اثناء میں چودھری محمد علی صاحب سے بھی ملا اور ان سے کہا کہ لاہور میں جو کچھ ہوا ہے' بہت برا ہوا ہے' اس سے ساری باتیں اور ہمارا سارا کیا کرایا ختم ہو جائے گا' نہ ہی آپ کی وزارت بچ سکے گی۔ آپ سے ان لوگوں نے ضرور کہا ہو گا کہ اگر ایک جگہ دو پارٹیاں آپ کی حمایت میں رہیں گی تو آپ کی وزارت زیادہ مستحکم رہے گی اور

آپ سردار نشتر کی دخل اندازیوں سے محفوظ رہیں گے مگر اس طریقہ سے انہوں نے آپ کو دو اسٹولوں پر کھڑا کر دیا ہے۔ جب یہ دو اسٹول ایک دوسرے سے دور ہونے لگیں گے تو آپ ان کے بیچ میں گر جائیں گے۔

چودھری صاحب مرحوم مجھ سے کھلے نہیں' میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے دماغ پر بوجھ ہے اور کچھ باتیں ہیں جو وہ کھل کر مجھ کو بتانا نہیں چاہتے۔ اٹھتے اٹھتے میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اپنے مسلم لیگی ساتھیوں کی ہمت افزائی کے لیے آج شام ہی لاہور جا رہا ہوں۔

چودھری صاحب نے پوچھا: "بہ حیثیت وزیر؟"

میں نے کہا "بہ حیثیت وزیر' بصورت دیگر بہ حیثیت ممبر پارلیمنٹ۔"

دونوں جملے معنی خیز تھے۔

شام کو میں لاہور روانہ ہو گیا۔ وہاں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے یہاں مسلم لیگ کے لٹے ہوئے قافلہ کے باقی لوگوں سے ملا۔ حالات معلوم کیے' ان کو دلاسا دیا کہ ہم سب اکٹھے ہیں' اکٹھے رہیں گے اور ری پبلکن کے پاؤں جمنے نہیں دیں گے وغیرہ وغیرہ۔

لاہور والی میٹنگ میں مسلم لیگ کو کس طرح توڑا گیا تھا وہ قصہ بھی وہاں سنا۔ معلوم ہوا کہ توڑنے والوں نے بڑی عیاری سے کام لیا۔ انہوں نے مسلم لیگ پارٹی کے اندر چھپ چھپ کر اپنا ایک گروپ پیدا کیا ہوا تھا جس کو ہدایات دی گئیں تھیں کہ وہ پہلے مسلم لیگ پارٹی کی میٹنگ میں شریک ہو کر اس بات پر زور دیں کہ ڈاکٹر خان صاحب جیسے غیر لیگی کو ہرگز چیف منسٹر نہ بنایا جائے اور جب لیگ یہ فیصلہ کر لے تو وہ راتوں رات لیگ سے ٹوٹ کر ایک نئی پارٹی ری پبلکن کے نام سے ڈاکٹر خان صاحب کی سربراہی میں قائم کر لیں اور اس میں شامل ہو کر ون یونٹ کی وزارتیں حاصل کر لیں۔ یار لوگوں نے اس حکمت عملی سے کام لیا اور مسلم لیگ کو تتر بتر کرنے والے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔

دوران قیام لاہور گورنر مشتاق احمد گورمانی مرحوم سے بھی میری باتیں ہوئیں اور ان باتوں سے میں نے تاڑ لیا کہ مسلم لیگ کو توڑنے میں کس ذات شریف نے کیا

حصہ لیا تھا۔

کراچی واپس آکر میں نے مرکزی کابینہ کی ایک فوری اسپیشل میٹنگ بلوانے کا نوٹس دے دیا اور وہاں ایک دھماکہ خیز تجویز پیش کر دی جس پر ایک زبردست ڈرامہ ہوا۔

تفصیلات اس وقت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ قانون کے تحت کابینہ کی باتیں کچھ عرصہ تک مخفی رہتی ہیں۔

قارئین کرام "جنگ" کو غالباً یاد ہو گا کہ یحییٰ خان مرحوم کے زمانے میں (جب چودھری محمد علی مرحوم خود بھی زندہ تھے) میں نے یحییٰ خان سے درخواست کی تھی کہ کابینہ کی کچھ باتیں شائع کرنے کی مجھے اجازت دی جائے۔ مگر انہوں نے یعنی یحییٰ خان نے تحریری طور پر اجازت دینے سے اس وقت انکار کر دیا تھا۔ میں نے ان کے خط کا عکس اسی زمانہ میں "جنگ" میں چھپوا دیا تھا۔ یہ بات بعض قارئین "جنگ" کو یاد ہو گی اور اخبار جنگ کے پرانے فائلوں میں موجود ہو گی۔

میرا خیال ہے کہ بندش کا مقررہ عرصہ اب تک ختم ہو چکا ہو گا مگر پھر بھی قانون دانوں سے پوچھ کر یقین کر لینا چاہتا ہوں۔

سردست صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ یہ ڈرامہ ایسا تھا کہ دنیا کی کسی کابینہ میں نہیں ہوا ہو گا۔ آج بھی ناظرین سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔

اس ڈرامے کے بعد دوسری صبح چھ بجے چودھری صاحب مرحوم بغیر ہم میں سے کسی کو بتائے' کراچی سے کوئٹہ چلے گئے اور تب تک وہاں رہے جب تک کامن ویلتھ پرائم منسٹرس کانفرنس کے لیے ان کو لندن جانا پڑا۔

(یہ سارا عرصہ مرکزی کابینہ کی کوئی میٹنگ نہ ہو سکی)

لندن سے چودھری صاحب مرحوم کی واپسی پر یہاں کراچی میں دونوں پارٹیوں کی میٹنگیں ہوئیں۔ پہلے مسلم لیگ پارٹی کی میٹنگ کی روداد سن لیجیے۔

یہ میٹنگ چندریگر مرحوم کے یہاں ہوئی اور جو دس گیارہ لوگ اب تک مسلم لیگ پارٹی میں رہ گئے تھے' وہ سب جمع ہوئے۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم بھی تشریف لے آئے۔ اسی روز ری پبلکن والوں نے بھی اپنی میٹنگ بلا رکھی تھی۔

ہم نے اپنا ایک وفد چودھری محمد علی مرحوم کے یہاں بھیجا کہ ان سے معلوم کر آئے کہ وہ ابھی تک مسلم لیگ میں ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو ہماری نشست شام کی میں شریک ہو جائیں۔

وفد کو چودھری صاحب مرحوم نے یقین دلایا کہ وہ مسلم لیگ میں ہیں اور شام کی پارٹی میٹنگ میں ضرور شریک ہوں گے۔

شام کو جب چار بج گئے اور چودھری صاحب مرحوم تشریف نہیں لائے تو ان کو لینے کے لیے چندریگر مرحوم کو خود ان کے یہاں بھیجا گیا۔

کچھ دیر کے بعد واپس آ کر انہوں نے یہ قصہ بیان کیا۔

"میں وہاں پہنچا تو اسی گھڑی اسکندر مرزا بھی وہاں آن دھمکا اور چودھری صاحب کو ری پبلکن پارٹی کی میٹنگ میں شریک کرنے کے لیے بازو سے پکڑ کر لے جانے لگا۔ میرا ہاتھ بھی ان کے دوسرے بازو پر پڑ گیا اور خوب کھینچا تانی ہونے لگی۔ آخر میں چونکہ اسکندر مرزا مجھ سے زیادہ طاقتور تھا' وہ چودھری صاحب کو کھینچتا ہوا اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے گیا۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لیگ پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ چندریگر مرحوم اور میں محمد علی کی کابینہ سے استعفیٰ دے کر باہر آ جائیں۔ دوسری صبح ہم نے حکم کی تعمیل کر دی اور اپنے استعفے داخل کر دیئے۔ ہمارے ساتھ نو دس مسلم لیگی ممبر بھی وزارتی پارٹی سے علیحدہ ہو گئے۔

ہماری پارٹی کی علیحدگی کی وجہ سے چودھری محمد علی مرحوم کی اکثریت ٹوٹ چکی تھی۔ مگر غالباً اسکندر مرزا نے ان کو یقین دلا رکھا تھا کہ مسلم لیگیوں کے مستعفی ہونے سے ان کی وزارت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہی وجہ تھی کہ چودھری صاحب نے مسلم لیگ سے تو اپنے استعفیٰ کا اعلان فرما دیا مگر پرائم منسٹری سے استعفیٰ نہیں دیا اور کچھ دن دیکھتے رہے۔

میرا قیاس ہے کہ ادھر اسکندر مرزا نے اپنے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ اب چودھری محمد علی سے بھی جان چھڑا لیں اور ان کی جگہ عوامی لیگ کے سہروردی مرحوم کو لے آئیں تاکہ عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی مل کر اور حکومتوں میں

رہ کر سردار نشتر کی مسلم لیگ کو اچھی طرح سے ملیامیٹ کر دیں۔

مرزا صاحب نے کچھ دن سہروردی مرحوم سے باتیں کیں اور اس کے بعد چودھری صاحب سے استعفیٰ لے کر اس کو پرائم منسٹر بنا دیا۔ (یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ استعفیٰ انہوں نے اپنی مرضی سے دیا یا اسکندر مرزا مرحوم کے مجبور کرنے پر)

بہر حال لوہے نے لوہے کو کاٹ دیا۔ چودھری صاحب اور مرزا صاحب دونوں کا تعلق نوکر شاہی سے تھا۔ دونوں اکٹھے دہلی سے تشریف لائے تھے۔ دونوں نے یہاں بھی مل کر سارا وقت کام کیا تھا۔ آخر میں ایک صدر بن گیا تھا' دوسرا وزیر اعظم۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب نئے آئین کے تحت صدارت کے لیے چودھری صاحب مرزا صاحب کا نامینیشن پیپر داخل کروا رہے تھے اور جب میں پیپر پر تائیدی دستخط کرنے سے کسمسا رہا تھا تو چودھری صاحب نے میرے تامل کا مطلب تاڑ کر مجھے یقین دلایا تھا کہ "اسکندر مرزا بالکل قابل اعتماد ساتھی ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ہم دونوں کا ساتھ رہا ہے۔ میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ صدر بنے گا تو ہر لحاظ سے اچھا ثابت ہو گا۔" ان کی اس یقین دہانی پر میں نے دستخط کر دیئے مگر سب سے آخر' جیسے کہ اس پیپر سے جو اب بھی اسمبلی کے پرانے ریکارڈ میں موجود ہو گا' ظاہر ہو گا۔

چودھری صاحب مرحوم بذاتِ خود بہت نیک آدمی تھے۔ ان کی یہ وزارت مسلم لیگ کے لیبل کے تحت لیگ کی وزارت تھی۔ اس وزارت نے 1956ء والا آئین دے کر ایک بڑا خلا پُر کر دیا تھا مگر افسوس ہے کہ اسکندر مرزا مرحوم نے سارے کام پر پانی پھیر دیا۔ مسلم لیگ پھر کبھی سنبھل نہ سکی۔ غدر کے زمانہ والا ہمایوں کا مقبرہ بن کر رہ گئی۔ نہ وہ تنظیم رہی۔ نہ وہ اصول نہ وہ قائداعظمؒ والی روایات۔ کئی کفن دزدوں نے بعد میں اس کی لاش کو جھنجوڑنے کی کوشش کی مگر کوئی جان پیدا نہیں ہوئی۔ یہ آمریت کے دور کے بعض چمچوں کے لیے آخری جائے پناہ بنی رہی۔

یہ مسلم لیگ کا مرنا کیا تھا ملک کی ساری منظم سیاسی لائف تباہ ہو گئی اور ہر طالع آزما کو موقع مل گیا کہ وہ جس طرح چاہے کرتا رہے اور جس طرح اس کی مرضی میں آئے عوام کے حقوق اور قائد کے اصولوں پر ڈاکے ڈالتا چلے۔

اسکندر مرزا نے 1956ء سے 1958ء تک دو سال کے اندر کئی وزارتیں

بنوائیں اور گرائیں۔ قریب قریب ہر سیاسی گروپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی۔ جب کسی وزارت کے پیچھے کوئی منظم اور مستحکم اور عوام کی نمائندہ پارٹی یا جماعت نہ ہو اور اس کی زندگی کا مدار محض کسی فرد واحد کی پسند اور ناپسند پر ہو تو وہ وزارت کس کام کی اور اس کی قدر و قیمت کیا؟

فی الحقیقت اسکندر مرزا مارشل لاء لا کر اس کی شمولیت اور اعانت سے' حکومت کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا' لہٰذا اس کے مفاد میں یہی بات تھی کہ ملک میں منظم جمہوری سیاست مستحکم نہ ہونے پائے۔ اس لیے اس نے پہلے مسلم لیگ کو ختم کیا اور بعد میں باقی پارٹیوں کا کام بھی تمام کر دیا۔ ان میں وہ بدقسمت ری پبلکن بھی تھے جن کو اس نے خود کھڑا کیا تھا۔

پس یہ رہا نتیجہ ملک کے حق میں' نوکر شاہی کے سیاست میں گھس آنے کا!

کون لایا؟......ایوب خان کو یا یحییٰ خان کو؟

اقتدار پر قبضہ کرتے ہی غلام محمد مرحوم نے یہ بات محسوس کی ہوئی تھی کہ فوج کو شامل کیے بغیر نوکر شاہی تنہا اور مستقل طور پر اپنا یہ قبضہ قائم نہیں رکھ سکے گی۔ اس خیال سے اس نے گورنر جنرل بنتے ہی مرحوم و مغفور جنرل ایوب خان مرحوم کمانڈر انچیف پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایوب خان خود بھی اس سے (یعنی گورنر جنرل سے) گہرا رابطہ رکھنا اس وجہ سے ضروری سمجھتا تھا کہ فوج کے اندر اس کی اپنی پوزیشن ابھی تک مستحکم نہیں ہوئی تھی' اس کی تقرری بعض سینئر جرنیلوں کے حقوق کو نظرانداز کر کے عمل میں لائی گئی تھی اور "راولپنڈی فوجی سازش" کے ذریعہ خطرہ کی گھنٹی بھی بج چکی تھی۔ ایسی کمانڈر انچیفی اس صورت میں ہی مستحکم ہو سکتی تھی کہ اس کو مرکزی حکومت کی' جس کے سربراہ غلام محمد مرحوم بن چکے تھے' پشت پناہی حاصل ہو۔

ایوب خان مرحوم بالطبع محتاط آدمی تھا۔ اس کو اب تک یہ یقین بھی نہیں ہوا تھا کہ نوکر شاہی (جو اس کو دعوت شرکت دے رہی تھی) کے اپنے پاؤں اس قدر مضبوط ہو گئے ہیں کہ اس کے آسرے پر فوج' قائداعظم کی روایات اور عوام کے جمہوری احساسات کے خلاف اس سے (یعنی نوکر شاہی سے) مل کر سیاست بازی کرنا شروع کر دے' لہٰذا وہ کچھ عرصہ ٹال مٹول کرتا رہا اور وہ اس طرح سے کہ وہ نوکر شاہی سے دور بھی نہیں ہوا مگر اس سے عملاً اقتدار میں حصہ دار بھی نہیں بنا۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ

اس زمانے میں یہ قیاس آرائیاں بھی ہو رہی تھیں کہ ایوب خان کو یہ یقین نہیں تھا کہ اس کے کہنے پر فوج من الحیث الجماعت سیاست میں ملوث ہونے پر رضامند ہو جائے گی کیونکہ:

(1) فوج کی ذہنی نشو و نما انگریز کے دور میں ہوئی تھی اور انگریز کا یہ اصول تھا کہ فوج اپنی جگہ پر الگ رہ کر اپنے فرائض انجام دیتی رہے اور سیاست اور سول کاروبار کے الجھاؤ سے خود کو قطعاً دور رکھے۔ انگریز کو یہاں سے گئے ابھی مشکل سے دو چار سال ہوئے تھے اور اس کے اصولوں کے اثرات ابھی مٹے نہیں تھے۔

(2) کئی جرنیل اور سینئر فوجی افسر جو باہر کے کالجوں میں پڑھ کر آئے تھے' باہر کی دنیا دیکھے ہوئے تھے اور اپنی جگر پر دنیا کی تاریخ سے واقف تھے' یہ سمجھتے تھے کہ نوکر شاہی سے شامل ہو کر سول معاملات میں الجھنے سے فوج کی پاکیزگی متاثر ہو گی اور اس کے لوگ بھی نوکر شاہی والی عادتیں رفتہ رفتہ اپنا لیں گے۔

آپ پوچھیں گے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ نوکر شاہی نے واقعتاً فوجی کمانڈر انچیف کو کوئی ایسی دعوت شرکت دی تھی؟

میری عرض ہے کہ اس بارے میں آپ ان تاریخی حقائق پر غور کر کے خود نتیجہ اخذ فرمالیں۔

(1) ایوب خان مرحوم نے اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں لکھا ہے کہ غلام محمد مرحوم اس پر وقتاً فوقتاً زور ڈالتا رہا تھا کہ فوج اقتدار پر قبضہ کر لے۔

(2) ایوب خان مرحوم نے 1958ء میں مارشل لاء لگتے ہی پہلے روز یعنی 8 اکتوبر 1958ء کو ریڈیو پر ایک اعلان کیا تھا جس کے الفاظ یہ تھے:

"آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں بارہا غلام محمد (مرحوم) کی اس دعوت کو کہ ملک پر قبضہ کرلوں' ٹھکراتا رہا تھا۔"

(ملاحظہ ہوں 9 اکتوبر 1958ء کے اخبارات)

(3) اس سے دو دن بعد یعنی 10 اکتوبر 1958ء کو ایوب خان نے اپنی پہلی پریس

کانفرنس میں پھر اس بات کا اعادہ فرمایا۔ میں اس موقع کا فوٹو پیش کر رہا ہوں' فوٹو میں ایوب خان مرحوم کے دونوں طرف دو بڑے سول افسر بیٹھے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ قابل غور ہے۔ ان سول افسروں میں سے ایک صاحب کو ایوب خان نے اپنا نائب یعنی ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نامزد کیا ہوا تھا۔ ساتھ ہی وہ سارے ملک کی سول انتظامیہ کا ہیڈ بھی رہا! کیا یہ صورتحال سول اور فوج کی باہمی شرکت کی دلیل نہیں تھی؟

(4) یہ مارشل لاء لگنے کے بعد کی باتیں ہیں مگر اس سے پہلے بھی یعنی شروع سے ہی غلام محمد مرحوم ایوب خان کو سیاسی امور میں گھسیٹتا رہا تھا مثلاً:

(الف) 1954ء میں جب غلام محمد مرحوم اور بوگرہ مرحوم کے مابین جھگڑا ہوا تھا اور بوگرہ مرحوم امریکہ کے دورے پر نکل گیا تھا تو غلام محمد مرحوم نے ایوب خان کو امریکہ تک اس کے پیچھے لگایا ہوا تھا۔

(ب) بوگرہ مرحوم کے امریکہ سے واپسی والے سفر میں ایوب خان اس کے ساتھ چپکا رہا اور کراچی اترتے ہی اس کو ایئرپورٹ سے سیدھا غلام محمد کے پاس لے گیا۔

(ج) جس وقت غلام محمد مرحوم پستول دکھا کر بوگرہ سے آئین ساز اسمبلی تڑوا رہا تھا تو اس وقت بھی (چودھری محمد علی کے علاوہ) ایوب خان بھی اس "محفل" میں موجود رہا۔

(د) غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو تڑوانے کے ساتھ بوگرہ مرحوم سے مرکزی کابینہ میں ایوب خان کو وزیر دفاع بنوایا۔ (ساتھ ہی اس نے فوج کی کمانڈر انچیفی بھی نہیں چھوڑی)

(ہ) غلام محمد مرحوم کی مہربانی سے اس وقت تک ایوب خان کی اس قدر سیاست سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ (جس طرح اس نے خود اپنی کتاب میں لکھا ہے) لنڈن کے کلیرج ہوٹل میں رہتے ہوئے وہ پاکستان کے آئینی مسائل کے بارے میں پلان بنانے لگ گئے تھے۔

(ان حقائق کے بارے میں ملاحظہ ہوں۔ (1) ایوب خان کی کتاب'

(2) چودھری محمد علی مرحوم کی کتاب '(3) آخر اکتوبر اور شروع نومبر 1954ء کے اخبارات)

(5) غلام محمد مرحوم کی علالت کی وجہ سے جب اس کی جگہ پر اسکندر مرزا مرحوم 1955ء میں قائم مقام گورنر جنرل بنا تو یہ تقرری کابینہ نے ایوب خان مرحوم کی تحریک پر ہی کی۔

(6) اسی اسکندر مرزا نے بالآخر 1958ء میں مارشل لاء لگایا اور اقتدار میں نوکر شاہی سے فوج کی شرکت والے پرانے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ یاد رہے کہ ایوب خان مرحوم نے خود کوئی "فوجی" "کو" نہیں کیا۔ وہ خود زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہوا۔ اس کو راولپنڈی سے بلا کر اس پر ذمہ داری ڈالنے والا اسکندر مرزا تھا جس نے اپنا حلف توڑ کر آئین منسوخ کر کے اور غیر قانونی حکم سے مارشل لاء لگا کر ملک ایوب خان کے حوالے کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اسکندر مرزا کو یہ خیال تھا کہ ایوب خان اس احسان کے بدلے میں اس کو پاکستان کا بادشاہ بنادے گا اور خود اس کا سپہ سالار بن کر رہنے پر قانع ہو جائے گا اور جو چیز اس کے خاندان نے مرشد آباد میں کھوئی تھی' اس کی تلافی وہ اب پاکستان کا بادشاہ بن کر کر دے گا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ دو شیر ایک ہی جنگل میں اکٹھے نہیں رہ سکے۔ ایوب خان نے اسکندر مرزا کو معزول کر کے لندن روانہ کر دیا اور خود پاکستان کا بے تاج بادشاہ بن کر نہ صرف سیاست بلکہ ساری قوم کو اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے خواب دیکھنے لگا۔

آپ اس سارے سلسلے کی کڑیاں ملا کر فیصلہ کر لیجئے کہ شروع میں کون کس کو لایا؟ آیا ایوب خان اور اس کی فوج خود زبردستی سیاست میں گھس آئے یا ان کو لانے والے نوکر شاہی کے بزرگ تھے؟

پھر ایوب خان کے دور میں کس گروہ کے وارے نیارے ہوئے؟ کس گروہ کے لوگ اس کے مشیر تھے؟ ایوب خان کے نام پر فی الحقیقت حکومت کا کاروبار کون چلا رہے تھے؟ وہ کون لوگ تھے جو ایوب خان کو گھیرے میں لیے رہے؟

آپ کو غالباً اب تک وہ نام یاد ہوں گے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ایوب خان مرحوم کو چلانے والے وہ لوگ تھے' ان درباریوں میں کوئی فوجی افسر تو تھا نہیں یہ سب سول نوکر شاہی کے ہی چشم و چراغ تھے یعنی کام ان کے تھے' بدنام ایوب خان ہوتا رہا۔

انتظامی معاملات میں ایوب خان نام کا سربراہ تھا۔ اس کی طرف سے کام کرنے والے اور عوام کو دکھ دینے والے سارے کے سارے نوکر شاہی کے آدمی تھے۔

یہ کس کی سوچ تھی کہ دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی منتقل کیا جائے اور وہاں ایک نیا شہر بسایا جائے۔ جہاں نوکر شاہی کے لوگ کفایتی نرخوں پر نئی پراپرٹیاں بنا سکیں؟ یہ صحیح ہے کہ آخر وقت پر اس کمیٹی کا چیئرمین جنرل یحیٰی خان کو بنایا گیا تھا مگر کیا یحیٰی خان ایسا شخص تھا جو اپنی طرف سے کوئی چیز سوچ سکتا تھا؟

میں مانتا ہوں کہ انتہا میں بدنامی کا سارا بوجھ ایوب خان مرحوم پر پڑ گیا مگر فی الحقیقت اس کے دور حکومت میں کس نے اپنے گھر بھرے' کالونیاں بنائیں' محل کھڑے کیے' اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے یورپ اور امریکہ بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا اور سہروردی اور قیوم خان کے پایہ کے قومی رہنماؤں کو ایبڈو کے تحت ذلیل کروانے کے لیے جھوٹی شہادتیں فراہم کیں؟

ان دنوں انتظامیہ میں فوج کا تو کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ایوب خان کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے والے تو یہ سول سروس والے تھے (یا چند باہر کے پیشہ ور چمچے) پھر ایوب خان کے کان تک خبریں پہنچانے والے کون تھے؟ کس نے اس کو یہ گُر سکھائے کہ وہ شعبدہ بازیوں کے ذریعے اپنی حکومت کو مستحکم کرے۔ بی ڈی کا ڈھکوسلا چلائے' بوگس مسلم لیگ بنائے اور "عشرہ اصلاحات" منائے؟ کون اس کی طرف سے پروپیگنڈہ چلا رہا تھا؟ کون اس کے بیان لکھ رہا تھا؟ کون اخبارات کا ایمان بگاڑتا رہتا تھا؟' اس سارے دور میں نوکر شاہی کے کتنے آدمی ایسے باضمیر نکلے جنہوں نے بطور احتجاج یا عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے' اپنے کو ایوب خان کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا ہو؟ (لاکھوں آدمیوں میں سے صرف ایک نکلا جو اس وجہ سے قبل از وقت ریٹائر ہو گیا اگر کوئی دوسرا بھی تھا تو مجھے اس کا نام معلوم نہیں)

مادرِ ملت کے خلاف الیکشن میں، ایوب خان کی طرف سے کس نے کام کیا؟ کون نوٹوں کی صندوقیں بھر بھر کر یہاں سے مشرقی پاکستان لے جاتا رہا تھا؟ اپوزیشن کے خلاف جھوٹے فوجداری مقدمے بنانے والے کون تھے؟

نوکر شاہی نے کس دور میں ملکرانی کے زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے لیے حاصل کر لیے تھے؟ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ہر ڈپٹی کمشنر کو پانچ سو صفحے کی ایک کتاب بھیجی گئی تھی جس میں ان کے اختیارات کی تفصیل مندرج تھی اور وہیں سے بعض اضلاع میں نیچے کی سطح تک رشوت خوری (اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر لاقانونیت) کے گردن توڑ دور کی ابتدا ہو گئی تھی۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ رشوت خوری کی جو اس قدر شکایت تھی تو یہ رشوت لینے والے لوگ کون تھے؟ کس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے؟ یہ بائیس خاندان جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے پاکستان کی ساری دولت سمیٹ لی تھی، کس کے تعاون کے منت کش تھے؟ کیا یہ ساری دولت انہوں نے خود ہضم کر لی یا اس کا کچھ حصہ ان کے معاون افسروں کے حصہ میں بھی آیا؟

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ نوکر شاہی کے سب آدمی بلا استثنیٰ کیریکٹر کے کچے تھے۔ یہ بات قطعاً نہیں تھی۔ ان میں بعض لوگ بہت ہی ایماندار بھی تھے اور ہر لحاظ سے صاف اور بے داغ، جہاں تک میرا اپنا تجربہ ہے میں نے چھوٹے گریڈ کے نو آموز افسروں کی بڑی اکثریت کو بہت ہی ایماندار اچھا اور بااخلاق پایا۔ اگر ان کی صحیح تربیت ہوتی رہتی اور اوپر والے ان کو خراب نہ کرتے تو یہ نوجوان فقیرانہ زندگی اختیار کر کے بھی پاکستان کی خدمت کرنے کے اہل نکلتے۔ افسوس یہ ہے کہ اوپر کی فضا مسموم ہو چکی تھی اور ان نو وارد نوجوانوں کو صحیح خطوط پر اپنی لائف اور کیریئر کو ڈویلپ کرنے کے لیے سازگار فضا نہیں مل رہی تھی۔ نہ صرف یہ مگر خود سینئر افسروں میں بھی کچھ لوگ خدا ترس، مخلوقِ خدا کے خیر اندیش اور خوش اخلاق تھے مگر اس طوفان کے دوران میں وہ نہ تین میں تھے نہ تیرہ میں۔ حقیقی پالیسی ساز اور ایوب خان کو چکر کھلانے والے نوکر شاہی کے وہ چند لوگ تھے جو سازشی دماغ رکھتے تھے۔ دن رات ریشہ دوانیاں کرتے پھرتے تھے۔ اور ایوب خان کے بہت ہی قریب اور اس کے دل و دماغ پر حاوی رہتے تھے۔ یہ انہی لوگوں کی کارگزاریوں کی وجہ سے تھا کہ ملکی عوام نوکر شاہی سے

نالاں رہے اور یہ طبقہ بدنام ہوا۔ فطرت کا قانون ہے۔ ایک مچھلی باسی بدبودار ہو تو سارا ٹوکرا مچھلیوں کا پھینک دینے کے قابل۔ کسی گروہ کی پہچان اس کی اکثریت کے عمل سے ہوتی ہے۔

چو از قومے یکے بے دانشی کرد
نہ اورا منزلت ماند نہ مارا

ممکن ہے کہ کہا جائے کہ ایوب خان کے مشیر اور آلہ کار کچھ پبلک کے آدمی بھی تو تھے۔ میں عرض کروں گا کہ یہ بھی خیال رہے کہ ایسے لوگوں کا پبلک کے ہاتھوں انجام کیا ہوا؟ کیا اس دور کے دونوں گورنروں منعم خان مرحوم اور کالاباغ مرحوم کی انتہا عبرتناک نہیں ہوئی؟ کیا 1970ء کے انتخاب میں ایوب خان یا یحییٰ خان کے متفرق چمچوں میں سے کوئی منتخب ہو بھی سکا؟

پاکستان کے عوام دیر گیر سخت گیر کے اصول کے قائل ہیں۔ قائداعظمؒ فرماتے تھے کہ ہمارے عوام پہلے سُست اور پھر چست اور آخر میں مست ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے مجرموں کو کبھی نہیں بھولتے۔

کیا نوکر شاہی کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے؟ کیا نوکر شاہی وقت کے ساتھ ساتھ پہلو بدل کر ہر آمر کے زمانے میں پھیلتی پھولتی نہیں رہی؟ اس کو کسی نے کیا سزا دی؟ اس کا بھی احتساب کبھی ہوا؟

آخر میں ایوب خان کو نکالنے اور یحییٰ خان کو لانے والے کون لوگ تھے؟

ایوب خان کے دورِ حکومت کے آخری سال میں جب یہ انقلاب آ رہا تھا تو میں اتفاقیہ راولپنڈی میں تھا جو کچھ میں نے ان دنوں آنکھوں دیکھا وہ یہ تھا۔

(1) نوکر شاہی کے آدمی جو ایوب خان کے درباری تھے اندر ہی اندر کئی گروپوں میں بٹ چکے تھے۔ ہر گروپ کی یہ کوشش تھی کہ اگر ایوب خان رہتا ہے تو دوسرے گروپ پر اس کو سبقت حاصل ہو اور اگر جاتا ہے تو نئے دور میں بھی اس کی پوزیشن مقابلتاً مضبوط رہے اور اس زمانے میں ایوب خان کی صحت گر چکی تھی اور اس کا علاج کچھ اس طرح سے کرایا گیا تھا کہ اس کی دماغی تھکاوٹ میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نوکر شاہی کے

مختلف گروہوں نے اپنے اپنے مفاد میں اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ بات یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ یہ درباری افسر ایک دوسرے کے خلاف بڑے بڑے اشتہار لکھوا کر رات کے وقت اپنے آدمیوں کے ذریعے اسلام آباد اور راولپنڈی کے راستوں پر لگواتے رہتے تھے۔ یعنی ایک قسم کی وار آف سکسیشن (WAR OF SUCCESSION) شروع ہو چکی تھی۔

(2) فی الحقیقت نوکر شاہی کے اکثر لوگ ایوب خان کو ایک تھکا ماندہ مسافر یا بجھتا چراغ سمجھ کر (اور ان کے ہوتے ہوئے اپنے لیے ترقی کی مزید راہیں مسدود پا کر) اب اس کو (یعنی ایوب خان کو) چلتا کرنے کی فکر میں تھے' انہوں نے ایوب خان سے اس قدر دھوم دھام سے عشرۂ اصلاحات ہی اس مقصد سے کروایا تھا کہ اس سے عوامی ردعمل تیز ہو جائے کیونکہ یہ چیز عوام کے زخموں پر نمک پاشی کا اثر رکھتی تھی۔ آپ بدیہی حالات کے خلاف عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کریں گے تو ردعمل کا واقع ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے چنانچہ آپ کو یاد ہو گا کہ ادھر عشرہ اصلاحات ختم ہوا اور ادھر ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہو گئی' یہی چیز نوکر شاہی چاہتی تھی۔

(3) ایوب خان مرحوم آخری دنوں میں بعض ایسی چیزوں کی طرف مائل ہو رہا تھا جو سراسر نوکر شاہی کے مقاصد کے خلاف جا رہی تھیں۔ مثلاً اس نے اعلان کیا تھا کہ آئندہ انتخابات میں خود کھڑا نہیں ہو گا...... سیاست دانوں کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اس نے اقتدار کی منتقلی کے بارے میں باتیں شروع کر رکھی تھیں...... اس نے یہ اصول قبول کر لیا تھا کہ آئندہ صدارتی نظام کی جگہ پارلیمانی نظام رائج کیا جائے گا۔ اس نے سیاسی قیدی رہا کر دیئے تھے...... اگر تلہ سازش کیس واپس لے کر مجیب کے لیے سیاست کا راستہ کھول دیا تھا...... اور وہ اس بات کے لیے بھی تیار تھا کہ نئے انتخابات فوراً کروائے جائیں اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر۔

یہ رجحان نوکر شاہی کے لیے موت کا پیغام تھا۔ اگر یہ سوچ عملی صورت اختیار کر لیتی اور اقتدار عوام کی طرف منتقل ہو جاتا تو نوکر شاہی کا کیا حال ہوتا؟

(4) پس اپنے کو آنے والی اس مصیبت سے بچانے کے لیے نوکر شاہی نے آخری وقت پر کوئی ایسا پتا پھینکا کہ ایوب خان دوبارہ مارشل لاء لگا کر اور اقتدار یحییٰ خان کو دے کر خود یکایک میدان سے نکل گیا۔ یہی چیز نوکر شاہی چاہتی تھی اور اس نے کس طرح اس معذور شخص سے کروالی۔ یحییٰ خان کے مارشل لاء کے تحت دوبارہ یار لوگوں کے نصیب کھل گئے اور ملک پر ان کی گرفت کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔

ایوب خان کے جانشین یحییٰ خان مرحوم کو کوئی برا کہے مگر انصاف اور خدا ترسی سے کام لیا جائے تو کچھ چیزیں اس کی صفائی میں پیش کی جا سکتی تھیں مثلاً:

(1) یحییٰ خان خود کوئی فوجی "کو" کر کے اقتدار پر قابض نہیں ہوا تھا۔

(2) اس کو اقتدار میں بٹھانے والا ایوب خان تھا اور اس کے مشیر۔

(3) یہ مارشل لاء ایوب خان نے ہی لگایا اور اپنے بنائے ہوئے آئین کی ہی پابندی نہیں کی۔

(4) یحییٰ خان نے 'بغیر ٹال مٹول یا کسی شعبدہ بازی کے پہلی فرصت میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار' آزادانہ عام انتخابات کروائے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر۔

یہ صحیح ہے کہ آخری منزل پر اس سے بعض مہلک غلطیاں سرزد ہوئیں مگر جب تک حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کھٹائی میں سے نہیں نکلتی ہے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ وہ غلطیاں ان کی اپنی سوچ کا نتیجہ تھیں یا کسی مشیر بے تدبیر کے مشوروں کا شاخسانہ۔

حاصل کلام یہ کہ یحییٰ خان کے دور میں بھی فوج خود سیاست میں نہیں آئی تھی مگر اس کو لایا گیا تھا' شروع کا قصہ تو آپ سن ہی چکے ہیں کہ ایوب خان کو لانے والے اور سیاست کے راستے پر لگانے والے کون تھے؟

دارالحکومت کراچی سے کیوں اٹھایا گیا

نوکر شاہی نے بے مقصد اقتدار پر قبضہ نہیں کیا تھا' اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بہت سی چیزیں جو قائداعظمؒ کر گئے تھے ان کو منسوخ کر کے پاکستان کے حالات کو نوکر شاہی کے اپنے اغراض و مقاصد سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔

کئی چیزیں جو قائدؒ کے اصولوں کے مطابق تھیں یا جو وہ اپنی زندگی میں کر گئے تھے یا کرنا چاہتے تھے' وہ نوکر شاہی کے عزائم اور مفاد سے متصادم تھیں اور اس وجہ سے نوکر شاہی ان کو مٹا کر دم لینا چاہتی تھی مثلاً:

(1) عوامی جمہوریت کا تصور۔
(2) عوام کی منتخب پارلیمنٹ کی بالادستی۔
(3) آئینی حکومت۔
(4) ہر تین سال بعد آزادانہ انتخاب۔
(5) قرارداد لاہور میں بتائے گئے بنیادی اصول۔
(6) منظم سیاسی لائف جس کی بنیاد پارٹی یا جماعتی تنظیموں پر ہو۔
(7) متحدہ پاکستانی قومیت۔
(8) قومی زبان اردو۔
(9) ایسا دارالحکومت جو پاکستان کے مختلف اجزاء ترکیبی کے باہمی ارتباط و اختلاط اور ہم رنگی کا آئینہ دار ہو اور اس کی مشترک شہری زندگی متحدہ قومیت کے

تصور کو آگے بڑھانے اور فروغ دینے کا باعث بنے۔

یہ ساری چیزیں نوکر شاہی کو ناپسند تھیں اور ان کو مٹائے بغیر پاکستان نوکر شاہی کی ریاست نہیں بن سکتا تھا اور نوکر شاہی کا یہی عزم بالعزم تھا کہ وہ اس کو نوکر شاہی کی ریاست بنا کر ہی دم لے گی۔

آپ پچھلے مضامین میں وہ تصویر ملاحظہ فرما چکے ہیں جو قائد ملت کی شہادت (1951ء) سے لے کر ایوب خان کی آمد (1958ء) والے زمانے تک بنتی رہی تھی یعنی رفتہ رفتہ ہر وہ چیز تباہ ہوتی رہی تھی جو قائد نے بنائی تھی یعنی منظم سیاسی لائف...... آئین ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ...... پارلیمانی نظام...... عوامی نمائندوں پر مشتمل وزارتیں...... مسلم لیگ۔ عوام کے جمہوری حقوق۔ آزادانہ' آبرومندانہ اور بے خوف شہری زندگی...... ملکی کاروبار میں کفایت شعاری...... ملکی لیول پر قرض' امداد' گداگری اور خیرات طلبی سے نجات...... آزاد خارجہ پالیسی...... رشوت خوری اور دوسری قباحتوں سے پاک ملکی انتظامیہ...... عدلیہ کی عصمت...... وغیرہ وغیرہ۔

باقی صرف ایک چیز رہ گئی تھی یعنی دارالحکومت کے بارے میں قائداعظمؒ اور آئین ساز اسمبلی کا فیصلہ کہ یہ کراچی میں رہے۔

یار لوگ شروع سے ہی اس فیصلہ کو بھی بدلنے کی فکر میں تھے مگر ابتدائی دور میں ان کو موقع نہیں مل سکا تھا۔ یہ موقع ان کو تب ملا جب ایوب خان کا مارشل لاء لگا۔ (1958ء میں)۔

قائداعظمؒ نے کافی غور و خوض اور توقف کے بعد یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ پاکستان کا وفاقی دارالحکومت (یا مرکز) کراچی ہو۔

قائد مرحوم کوئی کام بغیر سوچ بچار کے نہیں کرتے تھے۔ وہ بڑے دور اندیش قومی رہنما تھے' جلد بازی ان کی طبیعت سے کوسوں دور تھی جو لوگ ان کے قریب رہے ان کو یہ معلوم تھا کہ وہ پہلے سوچتے تھے اور اس کے بعد کچھ کہتے یا کرتے تھے۔

بعد کی ہماری سب سے بڑی بد بختی یہ رہی کہ زبان سے تو ہم قائداعظمؒ کی عقیدت کا اظہار کرتے رہے مگر عمل کے لحاظ سے ہم نے ان کے ہر اصول اور ہر فیصلہ کو توڑنے میں ذرہ بھر شرم محسوس نہیں کی۔

میرے خیال میں بعد کے پاکستان میں سب سے بڑے مظلوم خود قائدؒ تھے جن کی ہر بات اور ہر اصول کو پامال کیا جاتا رہا۔ مگر زمانہ سازی کے خیال سے زبانوں سے قائداعظمؒ زندہ باد کی رٹ لگی رہی۔ کسی آرٹسٹ پر اس سے زیادہ کیا ظلم ہو سکتا تھا کہ اس کے شاہکار پر کالا برش پھیر دیا جائے؟ کسی محسن قوم کے ساتھ اس سے زیادہ کیا زیادتی ہو سکتی تھی کہ اس کے چھوڑے ہوئے ورثہ کی ہر بنیادی چیز کو اکھاڑ دیا جائے؟

یہ اس طرح ہے کہ کسی برگزیدہ شخصیت کے مزار پر گنبد تو بڑا بنا دیا جائے مگر اسی گنبد کے سایہ میں اس کے مجاور فحاشی کا کاروبار جاری کر دیں۔

قائدؒ کی چھوڑی ہوئی میراث پر تو ہم قبضہ کیے بیٹھے تھے مگر اس میراث کے انتظام کے بارے میں جو اصول انہوں نے اپنی وصیت میں متعین کیے تھے' ان سے سراسر منحرف تھے۔

کیا یہ بات قطعاً غیر منطقی نہیں تھی کہ قائد کا فیصلہ پاکستان کے بارے میں تو قابل قبول سمجھا گیا مگر پاکستان کے دارالحکومت کے بارے میں غلط قرار دیا گیا؟ ایک فیصلہ صحیح! دوسرا فیصلہ غلط!!

حالانکہ فیصلہ کرنے والا وہی ایک شخص!

جس طرح ابھی عرض ہو چکا ہے قائداعظمؒ نے کافی غور و خوض کے بعد وفاقی دارالحکومت کے لیے کراچی کو منتخب کیا تھا اور آئین ساز اسمبلی سے قرارداد منظور کروا کر اس کی مستقلی کے لیے فول پروف قانونی بنیاد فراہم کر والی تھی۔

بعض لوگوں کو یاد ہو گا کہ اس زمانہ میں اس مسئلہ پر کافی لے دے ہوئی تھی' سندھ والے اس کے حق میں نہیں تھے کہ کراچی ان کے صوبہ سے کٹ کر مرکزی تحویل میں چلا جائے' سندھی طالب علموں نے جلوس نکالے تھے' سندھ اسمبلی نے مخالفت میں قرارداد منظور کی تھی' اسمبلی ممبروں کے وفود نے جا کر قائداعظمؒ کے سامنے احتجاج کیا تھا' سندھ کا چیف منسٹر اسی مسئلہ پر قائداعظمؒ کا معتوب قرار دیا جا چکا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر قائداعظمؒ ان جملہ رکاوٹوں کے باوجود اپنے فیصلہ پر قائم رہے تھے کیونکہ وہ اپنے ذہن میں صاف تھے کہ پاکستان کے حق میں یہی مفید رہے گا کہ دارالحکومت کراچی ہو۔

قائداعظمؒ کے اس فیصلہ کی بنیاد ان دلائل پر تھی۔

(1) وفاقی دارالحکومت عوام کے بیچ میں ہونا چاہیے تاکہ حکمران ہر وقت عوام کے دل کی دھڑکن سنتے رہیں' ان سے گھل مل کر رہیں اور ایسی صورت حال نہ بنے کہ عوام اور حکمرانوں کے مابین ایک دوسرے سے غائرت یا دوری کا احساس پیدا ہو جائے۔

(2) کراچی پاکستان کے جملہ عناصر ترکیبی پر مشتمل ایک مشترک شہر تھا۔ گویا یہ شہر باقی پاکستان کی عکاسی کر رہا تھا۔ اس کی مشترک شہری زندگی' قائد کی نظر میں 'متحدہ پاکستانی قومیت کے تصور کو آگے بڑھانے کا موجب ہو سکتی تھی۔

(3) کراچی کے عوام' جن کے سیاسی شعور اور بیداری میں نئی مہاجر آبادی کی شمولیت سے مزید اضافہ ہوا تھا' پاکستان کی سیاست میں پروگریسو رول ادا کر کے 'ملکی سیاست پر عوامی اور جمہوری رنگ کے استحکام کا باعث بنیں گے اور مستقبل کی حکومتوں کی ہر غیر مناسب رجعت کو روکنے کی صلاحیت کو بروئے کار لا سکیں گے۔ بالالفاظ دیگر وہ مرکزی حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے رہیں گے۔

قائداعظمؒ کو عوام کے سیاسی شعور' ذہانت اور فکری دیانت پر کامل بھروسہ تھا۔ انہوں نے پاکستان کی تحریک ہی عوام کی مدد سے چلائی تھی۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ ان کے وسیع سیاسی تجربہ کے مطابق عوام غلط فیصلہ نہیں کرتے' ان میں نیچرل ذہانت یا SIXTH SENSE ہے جو ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ علاوہ اس کے عوام اس بیرونی دباؤ اور اندرونی ...... کھنچاؤ سے بھی محفوظ ہیں جس کے سامنے بڑے لوگ بوقت امتحان سپر انداز ہو جاتے ہیں۔

(4) کراچی میں اس وقت تقریباً ہر چیز بنی بنائی موجود تھی' چونکہ پاکستان کی پالیسی اس وقت یہ تھی کہ نہ قرض لیا جائے' نہ بیرونی امداد قبول کی جائے اور نہ کاسہ گدائی گردش میں لایا جائے۔ لہٰذا اس کا انحصار اپنے ذرائع پر رہے اور جیسے ہی ان ذرائع میں وسعت پیدا ہوتی جائے' اسی قدر ہی پاؤں پھیلایا جائے۔ قائدؒ

کو پاکستان کی آزاد خارجی پالیسی اور قومی شان اور آبرو کا خاص خیال رہتا تھا۔ وہ قرض یا خیرات کے پیسے سے ایک آزاد ریاست کا کیپٹل بنانا اور محل تعمیر کروانا، آزادی کے تصور اور قومی شان اور نیک نامی کے منافی سمجھتے تھے۔

(5) کراچی کی آب و ہوا معتدل تھی نہ زیادہ گرمی نہ ناقابل برداشت سردی۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے خاص طور سے مناسب تھی۔ (بعد میں جب یار لوگوں نے مرکزی اسمبلی کا اجلاس زبردستی مری میں بلایا تھا تو بنگال کے اکثر نمائندے پہلے روز ہی بیمار پڑ گئے تھے۔)

(6) بین الصوبائی کشاکشی کی اثراندازی سے محفوظ رکھنے کے لیے وفاقی دارالحکومت کا کراچی جیسے شہر میں جو سارے پاکستان کا ماء اللحم تھا، مناسب تھا۔

(7) مشرقی پاکستان (جہاں پاکستانی آبادی کی اکثریت رہتی تھی) کے لوگوں کے لیے کراچی آنا آسان رہے گا۔ سمندر کے راستے سے غریب سے غریب بنگالی بھی کراچی پہنچ سکے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس سہولت کی وجہ سے ان کے لوگوں میں اجنبیت کا احساس بھی جاتا رہے گا۔ جو مقصد وفاقی دارالحکومت کو مغربی پاکستان کے کسی دور دراز صوبے کے بغل میں رکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

(8) وفاقی دارالحکومت کے کراچی میں ہونے سے بنگالیوں کا یہ مطالبہ بھی دب جائے گا کہ چونکہ پاکستان کی مجموعی آبادی کی اکثریت بنگال میں بستی تھی، اس لیے پاکستان کا دارالحکومت بھی وہاں، یعنی ڈھاکہ یا چٹاگانگ میں ہونا چاہیے (قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ دارالحکومت اسلام آباد شفٹ ہونے کے بعد بنگالیوں کا یہ مطالبہ اس قدر زور پکڑ گیا کہ ان کی تالیف قلب کے لیے ایوب خان مرحوم کو ایک اضافی دارالحکومت ڈھاکہ میں بھی تعمیر کرنا پڑا تھا، جس کے معنی تھے ڈبل دارالحکومتیں، ڈبل خرچ اور ہر حصہ کے علیحدہ تشخص کو فروغ۔)

(9) نئے دارالحکومت کی تعمیر پر جو اربوں روپے دولت خرچ ہو گی وہ عوام کے

بھلے اور زیادہ ضرورت کے کاموں پر لگانا زیادہ مناسب سمجھا جاتا تھا۔ (قائداعظمؒ کے نظام ترجیحات میں عوام کی بہبود پہلے اور حکومتی جاہ و جلال کی نمائش بعد میں آتی تھی۔)

یہ تھے اسباب جن کی بناء پر قائداعظمؒ نے فیصلہ فرمایا تھا کہ دارالحکومت کراچی سے باہر جانے نہ پائے۔

مگر قائداعظمؒ اور اس کے بعد قائد ملتؒ کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد، جیسے ہی نوکر شاہی کا دور آیا تو اس کے پیٹ میں دارالحکومت کے بارے میں بھی چوہے دوڑنے لگے تھے۔

نوکر شاہی کو عوام سے وحشت تھی۔ فی الحقیقت اس کا مقابلہ ہی عوام سے تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ عوام کے بیچ میں ان کی نظروں کے تحت رہے، جہاں اس کا ہر فعل عوامی نقطۂ نظر سے ایکس رے ہوتا رہے یا عوام اس کو بروقت ٹوک سکیں۔

اس کے مقاصد کے حق میں یہی بات تھی کہ وہ عوام سے دور کسی ایسی جگہ جا کر اپنی بستی بسائے جہاں نہ عوام کی صورت اس کو نظر آئے، نہ عوام کی آواز اس کی سمع خراشی کا باعث بنے۔ یہ عام قانون ہے کہ جس کے دل میں چور ہوتا ہے وہ یہی ضروری سمجھتا ہے کہ اس کا پڑاؤ ایسی جگہ ہو جہاں لوگوں کی نظر اس پر نہ پڑے۔

لیاقت علی خان اکتوبر 1951ء میں شہید ہوئے اور غلام محمد مرحوم سربراہ مملکت بنے۔ ابھی مشکل سے چار پانچ مہینے گزرے تھے کہ نوکر شاہی لابی نے دو کاغذ یا نوٹ تیار کر لیے تھے۔

(1) ایک ون یونٹ کا منصوبہ تھا (یہ کاغذ سرحد کے سردار عبدالرب نشتر نے بعد میں آئین ساز اسمبلی میں پڑھ کر سنایا تھا اور اس پر زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔)

(2) دوسرے کاغذ میں دارالحکومت کو کراچی سے اٹھا لے جانے کا منصوبہ تھا۔

یہ دونوں کاغذ چند قابل اعتماد چمچوں میں تقسیم کیے گئے تا کہ وہ ان خطوط پر رائے عامہ کو تیار کرنے کی کوشش کریں۔

میں اس زمانہ میں سندھ آبزرور کا ایڈیٹر تھا۔ ایک روز میرا چیف رپورٹر یہ

دارالحکومت والا کاغذ میرے پاس لے آیا اور کہا کہ فلاں صاحب نے (جو نوکر شاہی کی لابی کا سرغنہ تھا) بڑے رازدارانہ انداز میں اور کافی چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے مجھ سے استدعا کی ہے کہ میں دارالحکومت کو کراچی سے نکلوانے کے حق میں آبزرور سے ایڈیٹوریل لکھواؤں۔ اس افسر کا خیال یہ تھا کہ چونکہ سندھ کی رائے عامہ 'شروع میں' دارالحکومت کے کراچی میں رہنے کے خلاف تھی' لہٰذا یہی مناسب رہے گا کہ شفٹ کرانے کی مہم کی ابتداء بھی سندھ کے اخبار آبزرور کی طرف سے ہو۔ وہ افسر غالباً یہ بات بھول گیا تھا کہ شروع میں بھی سندھ کی رائے عامہ کے خلاف یہ اخبار اس بات کے حق میں تھا کہ وفاقی دارالحکومت کراچی میں رہے (یعنی جب تک یار لوگ اس کو یہاں رہنے دیں' مجھے شک تھا کہ قائد کا یہ فیصلہ دیرپا ثابت نہیں ہوگا)

میں نے کوئی ایڈیٹوریل تو نہیں لکھا' البتہ میری باتیں اس بارے میں' مرحوم الطاف حسین ایڈیٹر ڈان سے ہوئیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ سازش بہت گہری ہے اور اوپر سے چلی ہوئی ہے۔ اس مہم کو چلانے کے لیے ''فالتو صحافیوں'' کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔ ''فالتو صحافیوں'' سے الطاف حسین کی مراد وہ لوگ تھے جن کا کسی مؤقر اخبار سے تو تعلق نہیں تھا مگر وہ بحالت بے روزگاری خود کو صحافی بتا کر سرکاری سرپرستی کی تلاش میں رہتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتلا دیا کہ ایسا ہی کاغذ ''ایک فالتو صحافی'' ان کے پاس بھی لے آیا تھا مگر انہوں نے اس کو ڈانٹ کر اپنے یہاں سے بھگا دیا تھا۔

اس کاغذ کا' جو میرے پاس میرا چیف رپورٹر لے آیا تھا' مضمون کیا تھا؟

مضمون یہ تھا کہ وفاقی دارالحکومت کو کراچی میں رکھنا نہیں چاہیے کیونکہ کراچی کی آب و ہوا میں سرکاری اہلکار بیمار پڑ جاتے ہیں۔ دفاع کے لحاظ سے بھی کراچی کا ساحلی شہر غیر موزوں ہے' یہ صنعتی شہر ہے اور یہاں کے صنعت کار افسروں کو للچا کر ان سے غلط کام لے سکتے ہیں۔ کراچی کی گنجان آبادی اور عوامی شور و شر میں نوکر شاہی کا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کر سکتا۔ آسٹریلیا کا دارالحکومت کینبرا میں ہے جو ایک نیا اور خاص شہر ہے۔

یہ سب دلائل بیہودہ تھے اور بعد کے تجربہ نے ثابت کیا کہ ان میں کبھی کوئی وزن نہیں تھا۔

سرکاری ملازم صرف کراچی میں بیمار نہیں پڑتے تھے' اگر بیماری کا معاملہ ہے تو وہ ان کو ہر جگہ پکڑ سکتی تھی۔ (اسلام آباد کا پولی کلینک ہر وقت بیماروں سے بھرا رہتا ہے)

دفاع کے معاملے میں بھارت خواہ افغانستان کی سرحدوں سے اسلام آباد کا فیصلہ ہوائی جہاز کے ذریعے صرف دو منٹ کا ہے اور آج کل کے زمانے میں حملے ہوائی جہازوں سے ہی ہوتے ہیں۔

صنعت کاروں سے کوئی شہر دور نہیں۔ اصلی مصیبت عوام کے لیے ہے جو ہزاروں روپیہ خرچ کر کے' اپنی شکایتیں لے کر اسلام آباد نہیں پہنچ سکتے خصوصاً اس صورت میں جب ملکی سیاہ و سفید کا مکمل اختیار مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں مرتکز ہو جائے۔

کراچی جیسے کھلے شہر میں' لاکھوں آدمیوں کے نظروں کے نیچے سرکاری افسروں کو للچانا اتنا آسان نہیں تھا جتنا اسلام آباد کی تنہائیوں' تاریکیوں' پہروں اور پردہ داریوں میں (آپ راولپنڈی کلب کی ممبرشپ دیکھ لیجئے' کتنے باہر کے صنعت کار اور تجار اس فہرست میں موجود ہیں)

اگر شہری شور و شر میں سرکاری اہلکاروں کا دماغ مختل ہو جاتا تو دنیا کے تقریباً جملہ دارالحکومتوں میں (جو بڑے شہروں میں واقع ہیں) کام کرنے والے سرکاری اہلکار کب کے پاگل خانوں میں داخل ہو گئے ہوتے مگر وہاں یہ نہیں ہوا ہے۔ لنڈن' پیرس' پیکنگ' برلن' ٹوکیو' ماسکو' واشنگٹن' کافی بڑے شہر ہیں۔ اکثر کراچی سے بڑے ہیں اور دارالحکومتیں وہاں ہیں۔

تنہا آسٹریلیا کے کینبرا کی مثال چونچ میں لے کر اڑنا صریح زیادتی تھی۔ آسٹریلیا کا محل وقوع' بقول شخصے سات سمندروں کے بیچ میں' اس کی آبادی محدود اور اراضی بے تحاشا۔ ہر یونٹ خود مختار' ارتکاز اختیار کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مرکز کے پاس اختیارات محض جزوی اور فروعی اور پھر پارلیمانی جمہوریت کی برکتیں میسر!

مزید تین باتیں' اس بارے میں نظر انداز ہو رہی تھیں۔ (1) کراچی کے بارے میں اس ملک کے بنانے والے قائداعظمؒ کے فیصلے کا احترام اور اس کی آئینی اور

قانونی بنیاد۔ (2) جن حکمرانوں نے اپنے دارالحکومت عوامی شہروں سے دور لے جا کر نئے شہر بسا کر ان میں رکھے تھے' وہ سب انقلابات کی زد میں آ کر تباہ ہو گئے اور وہ علیحدہ بستیاں اب دنیا کے لیے عبرت گاہیں ہیں مثلاً ورسائے' زار سکو سیلو' چین کا شہر ممنوعہ FORBIDDEN CITY (3) مشرقی پاکستان کی نفسیات پر دارالحکومت کی کراچی سے منتقلی کے اثرات کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ یاد رہے کہ شروع کے زمانہ میں بنگالیوں نے کراچی کو ایک مشترکہ ملکی میراث سمجھ کر یہاں اپنی جائیدادیں بنائی تھیں بعد میں جیسے ہی دارالحکومت کراچی سے منتقل ہوا' بنگالیوں کی پاکستانیوں سے امیدیں ٹوٹ گئیں۔ ان کے دلوں میں بے پناہ شکوک پیدا ہوئے اور ان میں اجنبیت کے احساس نے جنم لیا۔ انہوں نے کراچی کی جائیدادیں بیچ کر مغربی پاکستان سے راہ فرار اختیار کی۔ جلد ہی چھ پوائنٹ بنائے' مسلح بغاوت کی اور ہم سے علیحدہ ہو گئے اور ہم دولخت' دولخت کا رونا روتے رہ گئے!

شروع میں دارالحکومت کو کراچی سے منتقل کرنے والے منصوبے کو اس وجہ سے عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا تھا کیونکہ (1) اس وقت تک ابھی جمہوریت یہاں لنگڑا رہی تھی۔ (2) ٹوٹی پھوٹی پارلیمنٹ موجود تھی جس کی منظوری کے بغیر دارالحکومت تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ (3) پارلیمنٹ میں بنگالی عنصر موجود تھا جس کی زبان درازی سے یار لوگ بہت گھبراتے تھے۔ (4) رائے عامہ سازگار نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ (5) ملک کا کوئی معزز اور موقر اخبار اس منصوبے کی تائید کے لیے تیار نہیں پایا گیا۔ (6) اخبارات پر کنٹرول کا سامان نہیں تھا' ہنوز پریس ٹرسٹ قائم نہیں ہوا تھا۔

مگر جیسے ہی نوکر شاہی نے ایوب خان کا تعاون حاصل کر کے ملک پر مارشل لاء لگوا دیا۔ یہ رکاوٹیں دور ہو گئیں' مارشل لاء کے پہلے ہی سال میں دارالحکومت کراچی سے اٹھا کر راولپنڈی لے گئے۔ یہ کارروائی مارشل لاء کے تحت کرائی گئی جس کی وجہ سے نہ پارلیمنٹ سے منظوری حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی' نہ کسی آئینی خانہ پری کی۔ آئین منسوخ ہو چکا تھا اور پارلیمنٹ کالعدم۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر دارالحکومت کا کراچی میں ہونا گوارا نہیں تھا تو بھی اس کو لاہور یا ملتان لے جانا چاہیے تھا کیونکہ یہ دونوں تاریخی اور عوامی شہر تھے اور ان کو

تاریخی حیثیت حاصل تھی اور ایک شہر سے دوسرے شہر منتقلی سے خود قائداعظمؒ کے اس اصول کی بھی نفی نہ ہوتی کہ حکومت کو عوام کے بیچ میں رہنا چاہیے' عوام سے دور نہیں!

بہرحال یار لوگوں نے ایوب خان مرحوم کو یہ سبز باغ دکھا کر کہ نیا دارالحکومت ان کے آبائی مسکن کے قریب ہو گا' جس سے ان کے لوگوں کو بڑے فائدے پہنچیں گے۔ دارالحکومت کے لیے پوٹھوہار کو منتخب کروا لیا' جہاں اربوں روپیہ خرچ کر کے نیا شہر اسلام آباد تعمیر کر لیا گیا اور اس میں نوکر شاہی قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی (عوام سے دور) بطور کفارہ ڈھاکہ میں بھی اضافی دارالحکومت کی تعمیر کی ضرورت پیش آئی جس پر بھی کئی کروڑ روپے خرچ ہو گئے۔

بڑی خرابی تو یہ ہوئی کہ دو دارالحکومتوں کے بننے سے یہ تصور اجاگر ہوا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دو علیحدہ ملک ہیں۔

اب کی تو مجھے خبر نہیں کیونکہ کئی سال سے میں اسلام آباد نہیں گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اب وہ کیفیت نہ ہو مگر اس سے پہلے مجھے جب وہاں چھ سال رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ وہاں ایک عجیب و غریب درباری سب کلچر وجود میں آیا ہوا تھا۔ نچلے درجہ کے سرکاری ملازم تو کراچی کی نسبت وہاں تکلیف میں زیادہ تھے مگر اکثر بڑے لوگوں کو احساس برتری کھائے جا رہا تھا ان کی مزاجی کیفیت ایسی ہو چکی تھی جیسی دماغی امراض کے ہسپتالوں کے مریضوں یا آئسولیشن کیمپ ISOLATION CAMPS میں رکھے جانے والے لوگوں کی ہوتی ہے۔ کبھی غرور' کبھی تمرد اور پندار کی انتہا اور کبھی اس قدر مایوسی اور ڈیپریشن DEPRESSION کہ چہرے دیکھ کر رحم آ جائے! دونوں صورتوں میں مزاجی یبوست نمایاں!! توازن گم!!!

چند خصوصیتیں وہاں کی لائف کی یہ نظر آئیں: مثلاً (1) یہ ایک علیحدہ دنیا تھی جس کی باقی پاکستان سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ ملکی عوام سے تو اس کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ (2) صنعت کار تجار اور مالدار تو ہر وقت چلتے پھرتے اور سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے مگر ملک کے آٹھ کروڑ عوام کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ (3) وہاں کے رہنے والے لوگ نفسیاتی طور پر باقی پاکستان کی آبادی سے قطعاً کٹ چکے تھے۔ (4) وہاں کی

فضاؤں میں رہتے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ باقی ملک کا کیا حال ہو رہا ہے یا ملکی عوام کیا سوچتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ ملکی عوام سے کٹ کر ایک کیپسول کے اندر زندگی بسر کرنے سے وہاں کے سوچنے والے سوچ اور عقل کے معاملہ میں اس قدر خود کفیل ہو گئے تھے کہ وہ باقی ملک کے حالات سے اثر لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ کُن فیکون کے فلسفے پر چلتے رہتے تھے۔ ایسے حالات میں ان کی سوچ اور عوام کی سوچ میں ہم آہنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (6) بڑے بڑے سرکاری عہدیدار لوگوں سے ملنے سے اکثر کتراتے تھے' پیش کاروں کو حکم دے رکھا تھا کہ اگر پبلک کے کسی آدمی کا ٹیلی فون آ جائے تو جھٹ سے کہہ دیں کہ "صاحب میٹنگ میں مصروف ہیں" یا "صاحب ٹیبل پر نہیں ہیں" حالانکہ صاحب بہادر اس وقت ٹانگیں میز پر رکھے چائے نوشی فرما رہے ہوں گے۔ (7) وہاں کی ٹھاٹ باٹ کی زندگی میں کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ ملک میں کس قدر غربت ہے۔ (8) میٹنگوں کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر وقت ہر کام کے لیے کوئی نہ کوئی میٹنگ' میٹنگوں کی کثرت کی علت یہ تھی کہ کوئی شخص کسی فیصلے کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ معاملہ میٹنگ کے سامنے رکھ کر ذمہ داری کے بوجھ کو تقسیم کروا دے۔ اس میٹنگ بازی کی وجہ سے دفتر کا وقت ضائع ہوتا رہتا تھا۔ (9) ان میٹنگوں میں اکثر ایسی باتیں ہوتی تھیں کہ اگر شیخ چلی سن لیتے تو ان کو شکست ماننی پڑتی۔ خود ساختہ جھوٹے اعداد و شمار پر زور' حقائق سے گریز' گردو پیش کے حالات سے بے خبری' مستقبل کے خطرات سے عدم آگہی' نتائج سے لاپروائی اور یہ خیال کہ ڈنڈے کے زور سے ملکی کیڑوں مکوڑوں سے ہر بات منوائی اور ہر حکم کی تعمیل کروائی جا سکتی ہے۔ (10) کامل مکمل درباری' خوشامدی اور خود فریبی کا ماحول تھا۔ ہر اہل کار کی یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ وقت کے حاکم کو خوش رکھے تاکہ وہ ترقی اور پوسٹنگ کے معاملات میں دوسروں سے سبقت حاصل کر سکے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کر سکے جو (اولی الامر) کے مزاج کے خلاف ہو یعنی مصلحت کو حقیقت پر تفوق حاصل رہتا تھا۔ سچ آؤٹ آف باؤنڈ تھا۔ اس منافقت کی وجہ سے اگر وقت کا اولی الامر بھاڑ میں جاتا تو جانے دو' ما را ازیں چہ قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت!

باہر کا انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوتا تھا کہ جس اولو الامر کے مشیر ایسے ہوں

اس کا بالآخر بدنام اور ناکامیاب ہو کر نکلنا تعجب کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ (11) وہاں کے بڑے صاحبان شاید ہی کبھی گھر کی روٹی کھاتے تھے۔ تقریباً ہر شام بلاناغہ کسی نہ کسی سفارتخانہ سے دعوت کلو واشر بو تھی' انہیں رات کی محفلوں میں غیر ملکی لابیاں جنم پاتی تھیں اور پاکستان کی پالیسیوں کو ادھر یا ادھر موڑنے کے لیے اشارے ملتے ہوں گے۔ (12) چوٹی کے اہلکار کبھی آپس میں ملتے تھے تو باتیں ملکی مفاد کی نہیں بلکہ اس قسم کی ہوتی تھیں کہ کون آج کل بڑے صاحب کے قریب ہے' کس کو پروموشن مل رہا ہے اور کون کہاں جا رہا ہے۔ وغیر ذالک من الخرافات۔ (13) کئی بڑے افسروں نے وہاں اپنی پراپرٹیاں بھی بنا رکھی تھیں۔ یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ ایسے مسموم اور بازاری ماحول میں بھی خال خال کچھ افراد ایسے نظر آتے تھے جو ان آلائشوں سے قطعاً پاک و صاف اور ملک کے حقیقی خیر خواہ تھے' ان کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ایسی فضا میں یہ نیک نفس اور کیریکٹر کے بلند لوگ کیسے سانس لے سکتے ہوں گے مگر ان کی اپنی دنیا ہوتی تھی' سب سے دور کامل اطمینان قلب' نہ کسی کی دعوت کھانا نہ کسی لابی میں شریک ہونا' اپنے معاملات حوالہ خدا' ذاتی زندگی اور طرز رہائش اس قدر سادہ کہ دیکھ کر شروع اسلام کا زمانہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا اور درباریت سے اس قدر وحشت اور دوری کہ گویا ان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس شہر میں کوئی دربار بھی تھا۔

اسلام آباد کی لائف کا یہ تضاد حیران کن تھا۔

مگر مجموعی طور پر وہاں کا حال دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوا تھا کہ دارالحکومت کے بارے میں قائداعظمؒ کا فیصلہ ہر لحاظ سے صحیح تھا۔ اور جن لوگوں نے اپنے کو عوام سے دور قلعہ بند کرنے کی خاطر یہ فیصلہ توڑا انہوں نے بڑی زیادتی کی۔ خود اپنے حق میں بھی اچھا نہیں کیا۔ کون سا اولی الامر آج تک وہاں سے باآبرو نکلا ہے؟

بجٹ بازی، ٹیکس، محصولوں اور مہنگائی کی مصیبت

غلام محمد مرحوم کی مہربانی سے پاکستان کو نوکر شاہی کی ریاست بنانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مالیات پر سے پارلیمانی یعنی عوامی کنٹرول جاتا رہے' شاہ خرچی کے لیے آزادی میسر ہو جائے اور عوام کو کھٹ پٹ کرنے یا محصولات کے بوجھ تلے کراہنے کا موقع نہ ملے۔

مہذب دنیا میں یہ کہیں نہیں ہوا تھا کہ ملک کے خزانے پر فردِ واحد کا کامل کنٹرول رہے اور وہ جس طرح چاہے خرچ کرے' یا ٹیکس لگائے' اس سے پوچھنے والا کوئی نہ ہو' اسی بات پر برطانیہ کے شاہ چارلس اول کا سر کٹا تھا اور فرانس میں انقلاب آیا تھا اور انہی تجربات کے بعد جا کر یہ اصول طے ہوا تھا کہ NO TAXATION WITHOUT REPRESENTATION یعنی عوام کی نمائندگی کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں لگے گا۔ امریکہ کا صدر کانگریس کی منظوری کے بغیر ایک پیسہ خرچ نہیں کر سکتا۔ برطانیہ میں ملکہ وقت کی اپنی تنخواہ گھٹانے یا بڑھانے تک کا اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہے۔

مگر پاکستان میں غلام محمد کی تشریف آوری کے بعد نوکر شاہی کی یہ کوشش رہی کہ مالی معاملات میں عوام کی آواز کو گھٹاتے گھٹاتے آخر معدوم کر دیا جائے۔

یہ کام دو قسطوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا:

(1) غلام محمد سے اسکندر مرزا کے زمانے تک لولی لنگڑی پارلیمنٹ (جسٹس منیر

والے سیاسی فیصلہ کے تحت) چلتی رہی مگر پارلیمنٹ کو چلانے والی وزارتوں کی تقرری اور موقوفی کا مدار گورنر جنرلوں کی صوابدید پر رہا اور انہوں نے وزیروں کی اس قدر پٹائی کر رکھی تھی اور ان کو اس قدر بے حال کر دیا تھا کہ وہ مالی معاملات میں اوپر (یعنی گورنر جنرل) اور نیچے (یعنی نوکر شاہی) کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کو مجبوراً وہی کرنا پڑتا تھا جو یہ طاقتیں مل کر ان سے کرانا چاہتی تھیں۔ یہ اسٹریٹجی پانچ سال چلتی رہی' اس اثناء میں خرچ بڑھتا رہا اور ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا رہا

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

(2) پھر ایوب خان مرحوم اور اس کے بعد یحییٰ خان مرحوم کے دور آئے' ان میں تو مارشل لاء کے تحت یہ تکلفات بھی ختم ہو گئے اور مالیات پر مکمل کنٹرول فرد واحد کا ہو گیا' ایوب خان نے ایک مرتبہ کوشش کی تھی کہ بی ڈی نظام کے ذریعہ ایک بوگس پارلیمنٹ وجود میں لا کر اس سے بجٹ منظور کرا لیا جائے مگر کیا پدی کیا پدی کا شوربہ؟ چمچوں کی پارلیمنٹ اور اس سے یہ توقع کہ وہ اپنے آقا کی مرضی کے خلاف اس کے بنائے ہوئے بجٹ میں قطع و برید کر کے عوام کی شکایات کی تلافی کرا سکے گی!

غرض ان دو منزلوں میں نوکر شاہی نے یہ سارا سفر طے کر لیا اور مالی پالیسیاں عوام کے عمل دخل سے باہر ہو گئیں اور ان پر نوکر شاہی کا کامل کنٹرول ہو گیا۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟

نوکر شاہی نے جی بھر کے خرچ کیا۔ خوب اپنے کو پھیلایا' پارکن سن PARKINSON کہہ گیا تھا کہ "بیوروکریسی ہمیشہ اپنے جال کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی عادی ہوتی ہے۔" یہ سچ نکلا' لاکھوں کی تعداد میں نئے عہدے نکالے' طرح طرح کے کارپوریشن' بورڈ اور اٹانا منس اتھارٹیاں قائم کیں' ہزار ہا نئے دفتر کھولے' ہر دفتر کی سجاوٹ پر لاکھوں روپے لگائے: ہر کہہ و مہہ کے لیے ایئرکنڈیشننگ اور موٹر گاڑیوں کا بندوبست کیا' گشتی افسروں کے آرام کے لیے ریسٹ ہاؤس اور مہمان خانے بنوائے' بے شمار نئے محکمے کھولے' ہر منسٹری میں کئی کئی ڈویژنیں قائم کر ڈالیں' جہاں ایک کمشنری کافی ہوتی

تھی' وہاں اب کئی کمشنریاں قائم کر ڈالیں (انصاف کے دیوتا لوگوں کے دروں تک پہنچا بھی یا راستے میں ہی کہیں بھٹک گیا) پولیس کی نفری بغیر عدد حساب بڑھائی گئی' مگر جرائم میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ (ایک وجہ یہ تھی کہ پولیس غریب کا نوے فیصد وقت سیاسی کاموں کے پیچھے صرف ہونے لگا) ملک سے باہر بے تحاشا سفارتخانے ضروری خواہ غیر ضروری ملکوں میں کھلوائے' اربوں روپیہ خرچ کر کے دو نئے وفاقی کیپٹل CAPITALS اسلام آباد اور ڈھاکہ میں تعمیر کروائے۔ ڈویلپمنٹ کا طوفان چلایا مگر وہ طوفان طوفان ہی رہا' البتہ رشوت اور خورد برد کا بازار گرم رہا۔ قصہ مختصر ع تن ہمہ داغدار شد پنبہ کجا کجا نہم۔ آدمی اس زمانے کے بجٹ کی کتابیں کھولتا تھا تو اس کا سر چکرا جاتا تھا' مال مفت دل بے رحم کا قصہ ہر صفحہ پر لکھا ہوا ہوتا تھا اور پھر پوچھنے والا بھی کوئی عوامی ادارہ زندہ سلامت نہیں رہا تھا!

یہ لازمی بات تھی کہ جہاں خرچ اس بیدردی سے ہو رہا تھا' وہاں آمدنی بڑھانے کا بھی اتنی ہی بے دردی سے بندوبست کیا جائے' چنانچہ ہر سال ٹیکس' ڈیوٹیوں اور طرح طرح کے محاصل میں بے دریغ اضافہ ہونے لگا۔

1956ء خواہ 1962ء والے آئین کا PREAMBLE یہ تھا کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی چیز نہیں کی جائے گی۔ مگر ٹیکس اور متفرق محاصل کے معاملے میں اس اصول کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا جن محاصل کا حضور صلعم کے زمانے میں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا' وہ بھی یہاں عوام پر نافذ ہوتے رہے۔

زبان پر تو انگریز کے لیے گالیاں رہیں مگر ٹیکس و محاصل میں اسی کی ہی پیروی ہوتی رہی' حتیٰ کہ مُردوں کو بھی معاف نہیں کیا گیا' ان پر بھی DEATH DUTY لگائی گئی اور درجہ بدرجہ حال یہ ہو گیا کہ انسانی زندگی اور کاروبار کا کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا گیا جس پر کسی نہ کسی نام سے کوئی ڈیوٹی نہ جڑ دی گئی ہو۔

پاکستان بناتے وقت قائداعظمؒ نے انتہائی کفایت شعاری کا اصول پیش نظر رکھا تھا' مگر یار لوگوں نے اس اصول کی جڑ ہی نکال دی۔

اور پھر جب اس ساری داداگیری کے باوجود بھی خرچ پورا نہیں ہونے لگا تو خارجی پالیسی گروی رکھ کر سیٹو اور سینٹو معاہدے کر کے غیروں سے ایڈ لی گئی! قرض اور

خیرات کا روپیہ اس کے علاوہ!!! الامان والحفیظ۔

انگریز کے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ ہر تین چار سال بعد خرچ میں تخفیف کرنے کے لیے اسمبلی کی ایک رٹریچمنٹ کمیٹی RETRENCHMENT COMMITTEE بٹھائی جاتی تھی جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ دیکھے کہ انتظامی خرچ میں کہاں کہاں تخفیف کی گنجائش ہے تاکہ وہ تخفیف کر کے اس مناسبت سے عوام پر سے ٹیکس گھٹائے جائیں۔

ہمارے اس نوکر شاہی کے دور میں یا تو سرے سے اسمبلیاں ہی نہیں تھیں یا پھر جب کبھی بوگس اور جعلی اسمبلیاں بنیں تو ان میں چمچے بٹھا دیئے گئے جو اپنے لیے مراعات حاصل کرنے کے لیے تو کوشاں رہتے تھے مگر نوکر شاہی کی شاہ خرچیوں کے خلاف لب کشائی کی ان غریبوں (یا مزدوروں) کو جرأت نہیں ہوتی تھی!

ان ادوار میں بجٹ سازی کا ایک فیچر یہ بھی رہا کہ جب بجٹ ساز افسر صاحبان مرکزی آمدنی سے صوبوں کے لیے کوٹا متعین کرتے تھے تو اس بات کا خیال نہیں رکھتے تھے کہ کس صوبے سے مرکز کو کتنی آمدنی اور اس کے عوض اس کو مرکزی خزانہ سے کتنا کوٹہ دیا جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے بھاگنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بنگالی سمجھنے لگے تھے کہ مالی معاملات میں مرکز ان سے انصاف نہیں کر رہا ہے' یعنی ان کے صوبوں سے مرکز کو آمدنی تو زیادہ ہے مگر مرکز بعد میں جو کچھ ان کے صوبے کو دیتا ہے وہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ مجیب الرحمٰن کے چھ پوائنٹس کی جان یہ ایک پوائنٹ تھا جس میں بطور ردعمل' یہ تقاضا کیا گیا تھا کہ مرکز کو ٹیکس لگانے یا ٹیکس وصول کرنے کا کوئی اختیار نہ ہو' سارا پیسہ پہلے صوبوں کے پاس آئے اور وہی مرکز کو بطور گرانٹ ایک مقررہ کوٹا دیتے رہیں۔

ایک منزل پر خود مغربی پاکستان کے صوبوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو چلا تھا مثلاً نواب گورمانی مرحوم گورنر مغربی پاکستان نے ون یونٹ بل پر اپنی تقریر کے دوران اسی اصول کو (قدرے مختلف صورت میں) ون یونٹ کے جواز کے لیے پیش کیا تھا (یہ تقریر ان کی اسمبلی ریکارڈ میں موجود ہے) بعد میں بنگال علیحدہ ہو گیا۔ ون یونٹ ٹوٹ گیا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں مرکز اور صوبوں میں بدمزگی کی اصلی وجہ اس دور کے بجٹ سازوں کی یہ کوتاہ نظری، تنگدلی، غیر حقیقت پسندی اور سرزوری تھی۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یقین تھا کہ نوکرشاہی اب خدا ترسی سے کام لے کر اپنے خرچ میں آدھے جتنی کمی کر دے گی تاکہ ٹیکس دہندگان پر بوجھ کسی قدر ہلکا ہو جائے مگر یہ بھی نہیں ہوا۔ ملک آدھا رہ گیا۔ مرکز کی ذمہ داریاں اسی تناسب سے کم ہو گئیں مگر مرکزی انتظامیہ کا خرچ وہی رہا، جتنا پہلے ہوتا تھا، بلکہ غضب تو یہ ہوا کہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ یہ بات عقل و انصاف کے خلاف تھی مگر ٹیکس دہندگان کی طرف سے بولتا کون؟

بجٹ کے معاملات میں مواخذہ کرنے والا ایک ادارہ ملکی اخبارات ہو سکتے ہیں مگر ان کو بھی دو مصیبتوں نے گھیر لیا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی معذور ہو گئے تھے۔

(1) پریس ٹرسٹ کے نام سے آزاد اخبارات پر چھاپہ اور پریس آرڈیننس۔

(2) تجارتی جذبہ اور سرکاری اشتہارات سے پیسہ بنانے کا خیال۔

ان پابندیوں کے باوجود بھی اگر کوئی اخبار چوں وچرا کرتا تھا تو اس کے خلاف انکم ٹیکس کے نوٹس نکل جاتے تھے! بتائیے ایسے حالات میں کس کو پڑی تھی کہ وہ ٹیکس دہندہ عوام کی طرف سے کچھ لکھ کر اپنے اوپر مصیبت لے آئے؟

ویسے جس طریقہ سے بجٹ پیش کیا جاتا تھا وہ بھی ایک سمجھنے کی چیز ہوتی تھی بجٹ کا حساب و کتاب، آمدنی و خرچ کے اعداد و شمار کتابی صورت میں شائع ہوتے تھے مگر یہ ایک کتاب نہیں ہوتی تھی بلکہ آٹھ دس ضخیم کتابیں ہوتی تھیں جن میں ہندسوں کا جنگل ہوتا تھا۔ ماہروں کی بنائی ہوئی یہ چیز ماہر ہی سمجھ سکتے تھے، عام لوگوں کے سمجھنے یا اس سے کچھ مطلب نکالنے کی چیز نہیں ہوتی تھی۔ بقول شخصے لکھے موسیٰ پڑھے خدا!

جمہوری دور میں ہر جگہ دستور یہ تھا کہ ہر مخالف پارلیمانی پارٹی اپنے ممبروں میں سے دو ایک ہوشیار حساب دانوں کو، جو بجٹ بازی کی گھاتیں جانتے ہوں، بجٹ کے تجزیہ کے لیے مقرر کر دیتی تھیں۔ یہ ممبر سارا وقت بجٹ کا مطالعہ کر کے اس میں کیے گئے کھیلوں کا کھوج لگا کر باقی ممبروں کو پارلیمنٹ میں بجٹ پر تنقید کرنے کے لیے

"بریف" کر دیتے تھے اور اس پر تنقیدی ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا اور بجٹ سازوں کی عیاریاں طشت از بام ہو جاتی تھیں۔ اس مرحلہ کی اہمیت اور نزاکت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر بجٹ کے بارے میں صرف ایک روپیہ کی کٹوتی کی تحریک بھی منظور ہو جائے تو اس کو وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ سمجھا جاتا تھا اور وزارت کو فوراً مستعفی ہو جانا پڑتا تھا۔

مگر آئین منسوخ اور منتخب پارلیمان کے کالعدم ہو جانے کے بعد (یا جعلی اسمبلیوں کے محض چمچوں کی محفلیں بن جانے کے بعد) یہ جملہ تکلفات اور رکاوٹیں ختم ہو گئی تھیں۔ اب نوکرشاہی جو بجٹ بناتی تھی اس کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر ملک پر مسلط کر دیا جانے لگا۔ سندھی کی کہاوت ہے "جو ڈھیری گڈہ رکھپال" یعنی جو کا ڈھیر اور اس کا نگہبان گدھا!

کس نے کس سے غلط کام کروائے؟

کس نے کس سے غلط کام کروائے؟

کس نے کس کو استعمال کیا؟

نوکر شاہی کے پیچھے کہتے رہے کہ سیاستدانوں نے نوکر شاہی سے غلط کام کروائے اور اس کو بے جا استعمال کیا۔

سیاستدان' بزبان حال ہی سہی' کہتے رہے کہ نوکر شاہی نے ان کو خراب کیا اور جمہوریت کا بیڑا ڈبو دیا تاکہ پاکستان نوکر شاہی کی ریاست بن جائے۔

بات پرانی ہو چکی ہے مگر اب تک کبھی کبھی ان سوالات پر بحثیں چھڑتی رہتی ہیں۔ بہتر رہے گا کہ اس موضوع پر بھی کچھ حقائق پیش کر دیئے جائیں۔

پاکستان کی تاریخ کے یہ بنیادی نکات یا سنگ میل قارئین کرام کی آنکھوں کے سامنے رہنے چاہئیں:

(1) پاکستان بننے کے بعد قائداعظمؒ صرف ایک سال زندہ رہے...... چھ مہینے کام کرنے کے لائق چھ مہینے بستر علالت پر دراز۔

دوران علالت ان کے علاج کا بندوبست ان کی پوزیشن کے مطابق ہوتا رہا یا نہیں؟

اور پھر ان کے آخری دن کے بارے میں جو یہ سنا جارہا ہے کہ ان کو ہوائی اڈہ سے گھر تک اٹھا کر لانے کے لیے ایک ایسی ایمبولینس بھیجی گئی جو راستے میں

ٹوٹ کر دو گھنٹے کھڑی رہی اور مرض الموت میں مبتلا قائدؒ کا دم گرمی اور حبس کے مارے گھٹتا رہا اور مکھیاں ان کو کاٹتی رہیں۔ تو اس بات کی حقیقت کیا تھی؟ اس کے اسباب و علل کیا تھے؟ اور یہ کس ذات شریف کی کارستانی یا لاپروائی تھی؟ میں ان نکات کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ عرض کروں گا کہ پاکستان کے بننے کے بعد قائدؒ کی سیاست صرف اور صرف چھ مہینے چلی یہ کام مستقبل کے تاریخ نویس کا ہوگا کہ وہ تحقیق کر کے طے کرے کہ قائداعظمؒ کا اس حال میں انتقال صرف حضرت عزرائیل علیہ السلام کا کارنامہ تھا یا عزرائیل علیہ السلام سے یہاں کے یار لوگوں نے بھی پس پردہ بالواسطہ ہی سہی کچھ تعاون کیا تھا؟

(2) قائد کی جگہ لیاقت علی خان مرحوم آئے اور ابھی مشکل سے کرسی پر بیٹھ کر گردوپیش پر نظر ڈالنے لگے تھے کہ ان کو جام شہادت پلا دیا گیا۔

(3) ان کا دم نکلتے ہی نوکر شاہی نے ایک قسم کا "کو" COUP کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور غلام محمد مرحوم نے "دولت خداداد پاکستان" کو نوکر شاہی کی ریاست بنانے کا کام شروع کر دیا۔ نمونتہً پہلے ہی سال میں لاہور میں مارشل لاء لگا۔ منتخب صوبائی چیف منسٹر سے استعفیٰ لیا گیا۔ مولانا مودودیؒ اور دو ایک دوسرے مفکروں کو موت کی سزا سنوا دی گئی اور اس طرح سے مغربی پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں دہشت پھیلا دی گئی۔ سیاستدانوں کو دکھا دیا گیا کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ نئے حالات میں اقتدار دینے یا چھیننے کا اختیار عوام کے پاس نہیں رہا بلکہ ایک اور طاقت کے پاس چلا گیا ہے...... یعنی نوکر شاہی کے امام گورنر جنرل غلام محمد کے پاس! اس کے بعد رکوع و سجود کا رخ اسی طرف ہوگا۔

(4) اگلے سال پاکستان کے منتخب مرکزی وزیراعظم ناظم الدین مرحوم' کو ڈسمس کر کے خاص و عام پر واضح کر دیا گیا کہ اب جمہوری نظام دم توڑ چکا ہے۔ اس کے بعد نہ پارٹی سے پوچھنے کی ضرورت ہوگی نہ پارلیمان سے اعتماد کے ووٹ حاصل کرنے کی حاجت۔ جو کچھ ہوگا نوکر شاہی کا امام کرے گا۔

(5) اس سلسلے میں غلام محمد مرحوم نے ایک اور غضب یہ کیا کہ اس نے محکمہ خارجہ کے ایک ملازم کو، جو امریکہ میں سفیر تھا اور یہاں کی اسمبلی کا ممبر بھی نہیں تھا، نیویارک سے بلا کر پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا اور اس سے پاکستان کی تاریخ کی پہلی چمچوں کی وزارت بنوا دی۔ یہ صاحب محمد علی بوگرہ مرحوم تھے۔

(6) اس اثناء میں سیاستدانوں پر پڑودا کا آرا چلتا رہا تھا۔ وزد گفتن و بر بستن 95 فیصد سیاست دان سیاست کے لیے نااہل قرار دیئے گئے تھے جو بچے تھے ان کے خلاف سرکاری اخبارات سے اعصابی جنگ چھیڑ دار کھی تھی ...... فضل الحق غدار، سہروردی بھارت کا ایجنٹ، ممدوٹ خائن، کھوڑو قائد کا معتوب، میاں افتخار الدین سرخہ، شوکت حیات جھگڑالو، جی ایم سید مستحق دار، خلیق الزمان اچھوت، رہے نام اللہ کا!

ع جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے!

لیڈروں کے خلاف اس اعصابی جنگ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ عوام ڈر گئے اور ان بے چاروں کو مدتوں سے آزمائے ہوئے اپنے دوست بھی اب دشمن نظر آنے لگے۔ نوکر شاہی کی حکمت عملی یہ تھی کہ اندرون ملک نفرتوں کا ایسا طوفان مچا رہے کہ عوام کے اپنے ذہن کام کرنے سے عاری ہو جائیں اور ان کو دوست دشمن کی پہچان نہیں رہے تاکہ (جنگی اصطلاح میں) اس SOFTENING PROCESS کا فائدہ اٹھا کر نوکر شاہی اپنی پیش قدمی کو جاری رکھ سکے۔

(7) ایک سال اور، اور آئین ساز اسمبلی خود ختم، مولوی تمیز الدین آہ بلب نالہ بدل، پاکستان کی تصویر سے غائب اس پر مستزاد میاں منیر مرحوم کا سیاسی "فیصلہ" کہ جو کچھ ہوا درست ہوا، قوم کے حق میں ہوا، یعنی جمہوریت کی:

ع بازی برد ہوئی گوٹاں مک گیاں

(8) مرحوم غلام محمد جیسا لقوہ کا مارا ہوا ایک انسان اس تین سال کے مختصر عرصہ کے اندر اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ قائد اعظمؒ نے جمہوریت اور عوام کی سلطانی والے تصور کو اجاگر کرتے اور اس کی بنیاد پر پاکستان بنانے میں

پچاس سال لگائے تھے۔ اس نیم مردہ شخص نے اس ساری فکری عمارت کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ پر نوکر شاہی کی ریاست کو استوار کرنے میں صرف تین سال لگائے!

(9) آخری خدمت مرحوم کی یہ تھی کہ جب وہ قطعاً معذور ہو گئے تو جاتے جاتے اپنی مسند پر اپنے سے بھی زیادہ نیکوکار اور کنٹرولڈ ڈیموکریسی کے موجد جناب اسکندر مرزا کو بٹھا گئے۔ نورٌ علیٰ نور!

(10) دہلی سے آئے ہوئے نوکر شاہی کے اصحاب ثلاثہ میں سے ابھی ایک نیچے کی سطح پر رہ گیا تھا یعنی چودھری محمد علی مرحوم و مغفور، اس کو بھی اسکندر مرزا نے ملک کا وزیر اعظم بنا دیا۔

چودھری صاحب مرحوم کی یہ تقرری عجیب و غریب طریقہ سے عمل میں لائی گئی۔

مسلم لیگ پارٹی نے 1955ء والے نام نہاد، انتخابات کے بعد ایک قرارداد پاس کر کے گورنر جنرل (اسکندر مرزا) کو لکھا کہ وہ چاہتی ہے کہ سہروردی کو وزیر اعظم بنایا جائے جس کے گروپ سے مسلم لیگ نے کوالیشن کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ ظاہراً تو یہ ہوا اور پس پردہ یہ کوشش ہوئی کہ سہروردی کا بھوت دکھا کر اس کے رقیب مولوی فضل الحق کو مجبور کیا جائے کہ وہ سیکنڈ پوزیشن قبول کر کے چودھری محمد علی کے تحت کابینہ میں رہنا قبول کر لے۔ فضل الحق کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ وہ سہروردی سے بچنے کی خاطر محمد علی کا نائب بن کر رہنا منظور کر لے۔ تین دن اس کام میں لگ گئے اور جب یہ انتظام ہو چکا تو اسکندر مرزا نے مسلم لیگ پارٹی کو لکھ بھیجا کہ وہ سہروردی کے بارے میں پارٹی کی سفارش قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کی جگہ وہ مسلم لیگ کے اپنے آدمی چودھری محمد علی کو وزارت بنانے کے لیے دعوت دیتا ہے چنانچہ اس نے دعوت دے دی اور چودھری صاحب نے قبول فرما لی۔ قران السعدین ہو گیا۔ اسکندر مرزا سربراہ مملکت، چودھری صاحب وزیر اعظم، نوکر شاہی اس سے زیادہ کیا چاہتی تھی؟

فی الحقیقت یہ شطرنج کا کھیل تھا اور مختلف مہروں کو آگے پیچھے ایک ہی شخص یعنی اسکندر مرزا کر رہا تھا۔ چودھری صاحب مرحوم نے اپنی کتاب میں یہ قصہ یوں بیان کیا ہے کہ اسکندر مرزا نے ان کے گھر پر آ کر ان کو مجبور کر دیا کہ وہ وزیراعظم بننا قبول کریں اور اس لیے انہوں نے بادل نخواستہ ان کی یہ درخواست منظور فرمالی!

مگر اس تصویر کا دوسرا رخ بھی تھا جو میں بخوبی جانتا ہوں (گو کہ اس کو واضح کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔)

بہر حال اسکندر مرزا کو چودھری محمد علی مل گیا۔

دو دل یک شود بشکند کوہ را
پراگندگی آرد انبوہ را

(11) اس دور کے جو تقریباً ایک سال چلا' شاہکار یہ تھے:

(الف) 1956ء والا آئین بنا مگر اس میں نوکرشاہی کو آئینی تحفظات دینے کا اس پیمانے پر بندوبست ہوا کہ اس کو کوئی جمہوری ادارہ ہاتھ نہ لگا سکے۔ گویا یہ آئین بنا ہی اس لیے کہ نوکرشاہی کو آئینی مقام حاصل ہو جائے اور وہ سیسہ پلائی دیوار بن کر رہے۔ پاکستان کو نوکرشاہی کی ریاست بنانے والے مطمح نظر کی طرف یہ ایک ''مثبت'' قدم تھا۔

(ب) لاہور والی میٹنگ ہوئی جس کا ذکر پچھلے مضامین میں ہو چکا ہے' اس میٹنگ میں مسلم لیگ کو توڑا گیا اور ری پبلکن کے نام سے چمچوں کی پارٹی بنوا کر سارا مغربی پاکستان اس کے حوالے کر دیا گیا اور وہیں سے ون یونٹ کی پراگندگی اور اس کے خاتمہ کا سامان ہو گیا۔

(12) آخر 1956ء سے لے کر 1958ء تک تنہا اسکندر مرزا کا دور چلا اور یہ کام ہوئے۔

(الف) ملکی سیاست میں اس قدر بے یقینی اور پراگندگی پھیلائی گئی کہ کسی بااصول سیاستدان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ سیاست میں رہ سکے یا سیاست میں رہ کر نوکرشاہی کی بڑھتی ہوئی قوت کی مزاحمت کر سکے۔

(ب) ملک میں انتشار پھیلانے اور جمہوری سیاست کی بنیاد کو درہم برہم کرنے کی نیت سے صوبوں میں خلفشار پیدا کیا گیا۔ خود مرکز میں کسی وزارت کو چند مہینوں سے زیادہ چلنے نہ دیا گیا اور ہر گروپ کو چند روز وزارت میں بٹھا کر پبلک کے سامنے ناکام کر کے پھر نکال دیا گیا تا آنکہ پاکستان کی سیاست کوہ الموت کی امتحان گاہ بن گئی...... پارٹی کے چناؤ' اسمبلی میں اکثریت' اسمبلی کے اعتماد' عوام کے ووٹ جیسے تکلفات سب عملاً ختم ہو گئے' خود اس سیاست کے پیشہ کی آبرو ہی برباد کر دی گئی۔ انسان سیاست میں لوگوں کی خدمت کرنے اور عزت پانے کی غرض سے آتا ہے نہ اس لیے کہ خدمت کا موقع بھی نہ ملے اور پہلے کی عزت بھی گم ہو جائے۔ یہ حال دیکھ کر عزت پسند سیاستدان گوشہ نشین ہو گئے تا آں کہ وہ ساری سیاستدانوں کی نسل جس نے پاکستان بنانے میں حصہ لیا تھا۔ وہ بے تعلق بن کر بیٹھ گئی۔ ان کی جگہ نئے اچھے آدمی سیاست میں آنے سے گریز کرتے رہے۔ وجہ یہ تھی کہ سیاستدانوں کو جیل میں اذیتیں دینے اور پروڈا کی زحمتیں اٹھوانے کے علاوہ اس قدر بدنام کیا گیا کہ ان کے مقابلے میں فحش کاری پر زندہ رہنے والے بھی نیک نام اور نیکوکار نظر آنے لگے تھے۔

اور جب سچے سیاستدانوں کے انخلاء سے پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے کی ضرورت پیش آئی تو محض خانہ پری اور دنیا کو دکھانے کے لیے نوکرشاہی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر کچھ چمچے لے آئی جس کو کسی لحاظ سے بھی سیاستدان قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ کالی بھیڑیں ہر دور میں سامنے لائی گئیں اور ان کو استعمال کیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کو یہ موقع بھی دیا گیا کہ وہ لوٹ مار کریں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کالی بھیڑوں کی بداعمالیوں اور ضمیر فروشوں کو سیاستدانوں کے کھاتے میں نہ لکھا جائے۔ یہ چمچے سرے سے ہی سیاستدان ہی نہیں تھے۔ عوام نے ان کو کسی آزادانہ انتخاب میں نہیں چنا تھا۔ ان جعلی سیاستدانوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے بھی گھر بھرے اور نوکرشاہی کی بھی ہمت افزائی کی کہ وہ اپنی کالونیاں بنائے اور ٹیکس

کے پیسے سے رنگ رلیاں منائے۔ یہی چیز نوکرشاہی چاہتی تھی اور اس کے لیے چمچے ہی موزوں ہو سکتے تھے۔

(ج) اسکندر مرزا کی یہ اکھاڑ پچھاڑ دو سال چلی۔

(د) اس کے بعد اس نے ایوب خان کو بلا کر مارشل لاء لگا کر آئین دائین ختم کروا دیئے۔

(13) ایوب خان ذاتی طور پر کتنے ہی اچھے انسان تھے مگر ان کے قریبی مشیر پھر وہی نوکرشاہی کے خرانٹ تھے جنہوں نے ان سے غلط کام کروا کر آخر میں ان کو بے آبرو کر کے نکلوا دیا۔ اگر ایوب خان کو اپنی سوچ پر چلنے کا موقع ملتا تو بہت سی چیزیں جو ان سے کرائی گئیں وہ نہیں کرتے۔ اس شریف آدمی کو باور کرایا گیا کہ پاکستان کے عوام اس قدر سادہ لوح ہیں کہ ان کو آسانی سے پھسلا کر جمہوریت کے راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے شعبدہ بازی اور تشدد بہترین پالیسی ہو گی۔ ان سے پوڈو اور ایبڈو لگوا کر رہے سہے سیاستدانوں کی تذلیل کروائی گئی جن لوگوں نے تحریک پاکستان کے سلسلے میں نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں (مثلاً سہروردی، قیوم خان، کھوڑو) ان کو جیلوں میں ڈلوایا گیا یا ملک سے بھاگ جانے پر مجبور کیا گیا۔ سیاستدانوں کا استحصال اور چمچوں کا استعمال انتہائی دیدہ دلیری سے کروایا گیا۔ بنیادی جمہوریتوں کا ڈھکوسلا چلوا کر رشوت خوروں اور خورد برد کرنے والوں کا ایک نیا فرقہ پیدا کروا لیا گیا۔ ایک بوگس مسلم لیگ، ایک بوگس پارلیمینٹ اور ایک بوگس آئین ملک پر مسلط کروائے گئے۔ قائداعظم کا رتبہ کم کرنے کی غرض سے ان کی بہن کو شکست دلوائی گئی اور وہ اس مکروہ طریقہ سے کہ صنعتکاروں سے پیسہ لے کر بے انتہا رشوتیں دی گئیں اور انتخابات میں نوکرشاہی کے آدمیوں سے کھلم کھلا دھاندلیاں کروائی گئیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ یہ سب کچھ کرنے اور کرانے کے بعد عشرہ اصلاحات منانے کا انتظام کر کے عوام کو دعوت دی گئی کہ وہ اس میں شامل ہو جائیں۔

چہ دلاور است وزدے کہ بکف چراغ دارد

عوام نے اپنے ساتھ اس مذاق کا جواب یہ دیا کہ لاوارث حیوانوں کی گردنوں میں بورڈ ٹانگ کر ان پر جو کچھ ان کے دلوں میں تھا وہ لکھ دیا۔ "چینی چور" کے نعرے اس کے علاوہ!۔

اور جب نوکرشاہی خود ایوب خان کے دس سالہ دور حکومت سے اکتا گئی اور مزید ترقیوں کی راہیں اپنے لیے اس کے زمانے میں مسدود پائیں تو اس غریب کا بھی کوئی اچھا حشر نہیں کیا۔ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

(14) ایوب خان مرحوم کی جگہ پر اب مرحوم یحییٰ خان تشریف لے آیا۔ سیدھا سادا سپاہی آدمی تھا، نہ سیاست کی باتیں جانتا تھا نہ نوکرشاہی کی گھاتیں۔ بدقسمتی سے انہی مشورہ بازوں کے ہاتھوں چڑھ گیا۔ شروع میں اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر سیاست میں گھس جائے اور اس وجہ سے اس نے جلد سے جلد آزادانہ انتخابات کا اہتمام بھی کر دیا مگر بعد میں اس کو اکسایا گیا کہ چونکہ پاکستان کی صدارت لاوارث میراث کی طرح میدان میں پڑی ہے۔ اس کو اٹھا کر اپنے قبضہ میں کر لینا ملک کے مفاد میں ہو گا۔ وہ اس چکر میں آ گیا۔ نوکرشاہی نے اس کے انتخاب کے لیے پروگرام یہ بنایا کہ صنعتکاروں اور تاجروں سے بھاری رقمیں الیکشن فنڈ میں لے کر مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس پیسہ کے بل بوتے پر ان سب کے تھوڑے تھوڑے نمائندے منتخب ہو کر اسمبلی میں آ جائیں گے اور وہاں آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے۔ ان کی اس آپس کی لڑائی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان کو کسی بیچ کے آدمی کو صدر بنانا پڑے گا اور یہ بیچ کا آدمی یحییٰ خان خود ہو گا۔ اس پروگرام پر عمل ہوا۔ لاکھوں روپے نوکرشاہی نے اس بہانے سے اکٹھے کر لیے۔ اس مالِ غنیمت میں سے کس پارٹی کو کتنی رشوت ملی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہو گا کہ بہتوں کو ملا اور بہت کچھ ملا، مگر الیکشن کا نتیجہ نوکرشاہی کی توقع کے خلاف الٹا ہی نکلا۔ عوام برسوں سے دل ہی دل میں جلے بیٹھے تھے۔ موقع ملتے ہی انہوں نے سب رشوت خور

گروپوں کو رد کر کے سرے سے ایسی پارٹیوں کو چن لیا جن کا دعویٰ تھا کہ وہ ماضی کی روایات کو ختم کرنے اور نوکر شاہی کی پھیلائی ہوئی غلاظتوں کو نکالنے کے لیے باقاعدہ انقلاب لائیں گی۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے مجیب الرحمٰن کو اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو آگے کر دیا۔ فی الحقیقت یہ نتیجہ تھا اس شدید ردعمل کا جو عوام کے دلوں میں پچھلے سالوں کی مستبدانہ اور عیارانہ غیر جمہوری کارگزاریوں کی وجہ سے موجزن تھا۔ اب بھی حب الوطنی کا تقاضا یہ تھا کہ یحییٰ خان عوام کے فیصلے کو قبول کر کے پاکستان کے اتحاد اور استحکام کو قائم رہنے دیتا مگر یہ نہیں ہوا۔ اس کی جگہ اس سے فوجی کارروائی کروائی گئی جس کا نتیجہ سب کو معلوم ہے۔ البتہ جن لوگوں نے 1940ء والی قرارداد پاکستان پاس کرنے میں حصہ لیا تھا' ان کو آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ فوجی کارروائی اس قرارداد کے کون سے فقرہ کے تحت ہوئی!

یہ سب کچھ کہہ دینے اور شروع پاکستان کی تاریخ کا خاکہ پیش کرنے کے بعد' میں پاکستان کے اس دور کے سیاستدانوں کو بھی سو فیصد بے قصور قرار نہیں دیتا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے غفلت' سادہ لوحی اور کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا۔ ان کو چاہیے تھا کہ وہ شروع میں ہی اس نوکر شاہی والے مرض کو تاڑ کر اس کے علاج کے درپے ہو جاتے اور اس کے شر سے ملک کی جمہوریت اور قائداعظمؒ کے اصولوں کو بچانے کی کوئی تدبیر کرتے۔ مثلاً تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ وہ مرض کی نوعیت اور اس کے امکانات پہچان کر آپس میں متحد ہو کر ایک وسیع جمہوری پلیٹ فارم بنا کر اور ایک زوردار عوامی تحریک چلا کر اس کا بزاہِ راست مقابلہ کرتے تاکہ اس کے (یعنی نوکر شاہی کے) پاؤں جمنے نہ پاتے۔ کم از کم ان کو کسی صورت میں اس سے تعاون کرنا نہیں چاہیے تھا۔

مگر افسوس ہے کہ سیاستدانوں نے اپنے کو سادہ لوح ثابت کر دیا۔ وہ نوکر شاہی کی نیت پہچان نہیں سکے۔ اس کی باتوں میں آ کر اور اس کے ہاتھوں میں کھیل کر اپنی اور جمہوریت کی موت کا سامان کرتے رہے۔ شاعر کیا خوب کہہ گیا تھا:

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

آخر تک یہ بدقسمت فرقہ بات کی تہہ پر نہیں پہنچ سکا۔

نوکر شاہی کے یہ لوگ جب کسی سیاستدان سے ذاتی وابستگی اور وفاداری کے وقتی دم بھرتے تھے اور اس کو یقین دلاتے تھے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں' موصوف کے ذاتی مفاد میں جائے گا تو یہ ان کے دل کی آواز نہیں ہوتی تھی...... جب یہ پاکستان کی خیر خواہی کی باتیں کرتے تھے تو ان کی مراد کچھ اور ہوتی تھی...... جب یہ ملکی سالمیت کے لیے اپنی تشویش کا اظہار کرتے تھے تو اس سے ان کا مطلب اپنے فرقے کی سالمیت ہوتا تھا...... جب یہ کسی کے خلاف نفرت کے جذبات برانگیختہ کرنے کی کوشش کرتے تھے تو ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کوئی بھوت دکھا کر کسی بدقسمت سیاستدان کو اپنی لائن پر چلنے کے لیے مجبور کر دیں..... مثلاً مغربی پاکستان والوں کو مشرقی پاکستان والوں سے ڈراتے تھے' مغربی پاکستان میں ایک صوبہ کو دوسرے صوبہ کا بھوت دکھاتے تھے' لیاقت علی خان مرحوم کو مقامی صوبائی قیادتوں کا خوف دلاتے تھے' مقامی قیادتوں کو مہاجروں کے عزائم سے خبردار کرتے تھے' ناظم الدین مرحوم کو سہروردی مرحوم سے لڑاتے تھے۔ سہروردی مرحوم کو مولوی فضل الحق مرحوم سے لڑاتے تھے۔ میر غلام علی مرحوم کو کھوڑو مرحوم سے' قیوم خان مرحوم کو سردار نشتر مرحوم سے' دولتانہ کو ممدوٹ مرحوم سے' ممدوٹ مرحوم کو مسلم لیگ کی قیادت سے' غرض DIVIDE AND RULE نفاق ڈالو اور حکومت کرو۔ انگریزی اصول پر اس حد تک عمل ہوا کہ سیاستدان آپس میں لڑ مر کر من حیث القوم الجماعتہ نسیاً ونسیاً ہو گئے اور نوکر شاہی کے اصحاب ثلاثہ کے حق میں میدان صاف ہو گیا۔

کاش ہمارے سیاستدان روم کے پریٹورین گارڈ' ترکی کے جانیرون اور چین کے ہیجڑوں کی تاریخ پڑھے ہوتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ جب ملازم مالک کی گردن دبوچنے کا منصوبہ بناتا ہے تو اس کی حکمت عملی کیا ہوتی ہے اور وہ کیا کیا ترکیبیں کرتا ہے۔

حاصل کلام میں ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے سیاستدانوں کی سادہ لوحی کا مجرم تو قرار دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں!

آخر میں ہم اسی سوال کی طرف لوٹ آتے ہیں جس سے اس مضمون کی ابتداء

ہوئی ہے یعنی کس نے کس کو خراب کیا؟ نوکرشاہی کو سیاستدانوں نے بیجا استعمال کیا یا نوکرشاہی نے سیاستدانوں کو احمق بنا کر استعمال کیا۔

آپ یہ ساری سرگزشت ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ پاکستان بننے کے بعد نوکرشاہی کے ہاتھوں سیاستدانوں پر کیا بیتی؟ ان کو کبھی آرام اور اطمینان سے کسی عہدہ پر رہنے دیا گیا؟ ہر طرف سے ان کو خوف اور خطرہ نظر آتا رہا۔ پروڈا' ایبڈو' جیل' جلاوطنی' بڑے صاحب کی ناراضگی' ڈسمس' ٹریبونل' اعصابی جنگ' اخباری مہم' جھوٹے مقدمات وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ عوامی ووٹ' اسمبلیوں کے اعتماد اور پارٹی کی بیکنگ BACKING کا سوال ختم ہو چکا تھا۔ جمہوری PROCESS نظام درہم برہم رہا۔ آئینی تحفظات اور جمہوری روایات قصہ پارینہ تھے۔ سیاستدان بالکل یتیم بن چکے تھے۔ عوام نہ ان کو کرسی پر بٹھا سکتے تھے نہ کرسی سے نکال سکتے تھے۔ یہ سب اختیار سکہ کروقت کے بڑے صاحب کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا اور بڑے صاحب کے تعلقات براہ راست محکموں کے سیکرٹریوں سے ہوتے تھے کیونکہ بڑا صاحب یا تو نوکرشاہی کا اپنا آدمی ہوتا تھا یا اس کا لایا ہوا ہوتا تھا۔

پس ایسے حالات میں سیاستدانوں کی کیا مجال تھی کہ وہ کسی بیوروکریٹ کو مجبور کر کے اس سے غلط کام کروا سکیں۔ ان کے پاؤں زمین پر کب لگے کہ وہ یہ جرأت کر سکتے؟ وہ رات دن اپنی ہی پگڑی بچانے کی فکر میں رہتے تھے۔ ہر لحظہ وہ ڈرتے' کانپتے' ادھر ادھر دیکھتے رہتے تھے کہ کب کوئی طوفان آتا ہے اور ان کی پگڑی کو اڑا کر لے جاتا ہے۔ جمہوریت پر افتاد آجانے کے بعد سیاستدانوں کو کبھی کوئی ٹوٹی پھوٹی وزارت ملی بھی تو براہِ راست وقت کے بڑے صاحب کی مہربانی سے اور بڑے صاحب کی مہربانی منحصر ہوتی تھی دو باتوں پر (1) نوکرشاہی وزیر سے خوش رہے اور (2) وزیر کبھی اپنی آزاد خیالی نہ دکھائے۔

یہاں کہاں گنجائش تھی کہ کوئی سیاستدان یا وزیر زبردستی کسی بیوروکریٹ کا ایمان بگاڑ سکے۔

خبر رساں ایجنسیوں کا وزیروں سے سلوک

نوکرشاہی کا شروع سے ہی یہ ارادہ تھا کہ وہ پاکستان کو اپنی ریاست بنا کر رکھے۔ اس وجہ سے وہ نہ قائداعظم سے وفادار رہی 'نہ جمہوریت سے' نہ عوام سے' اس کی سارا عرصہ کوشش یہی رہی کہ قائداعظم کے اصول فراموش ہوں' جمہوری ادارے فیل ہوں اور قوم کے منتخب نمائندے ذلیل و خوار ہوں تاکہ اس کی اپنی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ نہ رہے۔

حکومتیں مخبری' خبر رسانی' سراغ رسانی' جاسوسی وغیرہ کے محکمے اس مقصد سے قائم کرتی ہیں کہ جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے اس سے ان کو باخبر رکھیں اور اگر کہیں کوئی خطرہ کا سامان ہو رہا ہو تو اس سے ان کو آگاہ کر دیں تاکہ وہ اس سے نمٹنے کے لیے پیشگی کوئی بندوبست کر سکیں۔ آپ نے سی آئی اے' ایف آئی بی' کے جی بی' سی آئی ڈی' انٹیلی جنس' انٹر سروسز وغیرہ کے نام سنے ہوں گے۔ یہ سب ادارے اسی کام کے لیے ہوتے ہیں۔

ہمارے یہاں پاکستان میں بھی اسی نوع کے ادارے قائم کیے گئے تھے اور ان پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے رہے اور وہ بھی اس طرح سے کہ ان کا کوئی حساب و کتاب ظاہر نہ ہونے پائے۔

یہ محکمے براہِ راست یہاں پرائم منسٹروں نے اپنے کنٹرول میں رکھے تاکہ اس کاروبار میں کوئی وزیر یا مشیر مخل نہ ہو اور ہر چیز بغیر رکاوٹ ان کے کان تک پہنچتی

رہے۔ مگر بدقسمتی سے یہاں کے یہ محکمے بھی نوکر شاہی کے OVER ALL نظام کا ایک حصہ رہے جس کی وجہ سے ان کی وفاداریاں' بنیادی طور پر اپنے فرقے کے ساتھ ہی رہیں اور وہ بدقسمت وزیراعظموں یا حکومت کے قائم مقام سربراہوں یا ملک کے کسی کام نہیں آسکے۔

چند مثالیں ان کی کارکردگی یا بیکاری کی زیر بحث دور (1947ء سے 1971ء تک) سے متعلق' بلاخوف تردید پیش کی جاسکتی ہیں۔

وزیراعظم لیاقت علی خان مرحوم کے قتل کی سازش ایک دن کے اندر پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے والی بات نہیں تھی۔ یہ سازش مختلف آدمیوں کے مابین ایک عرصے سے زیر بحث رہی ہوگی۔ اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے کئی چیزوں کو ایک پروگرام کی صورت میں مربوط کرنا پڑا ہوگا جس میں کافی وقت لگا ہوگا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ قاتل سید اکبر کا پس منظر کسی کو معلوم نہیں تھا۔ یہ شخص پہلے سے ان اداروں کی زیر نگرانی رہا۔ اندرون ملک گھومتا پھرتا اور بہت لوگوں سے ملتا رہا۔ پشاور سے کراچی آیا۔ یہاں کے ہوٹل میں ٹھہرا' پھر پشاور' ایبٹ آباد اور راولپنڈی کے چکر کاٹتا رہا۔ یہ سارا وقت وہ ایک کافی وزن دار ریوالور بغیر لائسنس اپنے ساتھ لیے پھرا اور ظاہر ہے کہ وہ اپنا نشانہ پکا کرنے کی مقصد سے اس ریوالور کو چلاتا بھی رہا۔ پھر اس کو پیشگی یہ اطلاع پہنچ جاتی ہے کہ فلاں دن' فلاں وقت اور فلاں جگہ لیاقت علی خان راولپنڈی آکر ایک جلسے سے خطاب کرنے والے ہیں۔ اس دن سے کچھ روز پہلے یہ مسلح قاتل بھاری ریوالور لیے سرحد سے چل کر راولپنڈی پہنچتا ہے اور کسی ہوٹل میں رہنے لگتا ہے۔ راولپنڈی میں قیام کے دوران یہ لازمی بات ہے کہ وہ دربند کر کے کمرے میں لیٹ نہیں گیا ہوگا بلکہ چلتا پھرتا رہا ہوگا' اشخاص سے ملتا بھی رہا ہوگا اور بالآخر وہ میٹنگ والے دن ہوٹل سے چل کر جلسہ گاہ پہنچتا ہے اور جلسہ میں بالکل آگے کی صف میں پرائم منسٹر مرحوم کے سامنے بیٹھ جاتا ہے...... اور اس کے قریب وہ شخص بیٹھ جاتا ہے جس کو اسی لحظہ' یعنی کام پورا ہو جانے کے بعد' خود قاتل کو قتل کر دینا تھا...... یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا۔ اگر کسی کی آنکھ نہیں کھلی اور کسی کو شبہ نہیں ہوا تو ہماری خبر رساں ایجنسیوں کو جن کا فرض تھا کہ وہ پرائم منسٹر کی حفاظت کریں' جو خود ان کے محکموں کا ہیڈ بھی تھا۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس سازش کا تعلق تین صوبوں سے رہا...... لیاقت علی خان کراچی سے چلے' سید اکبر سرحد سے روانہ ہوا اور واردات ہوئی پنجاب میں۔ اگر سازش کے تین مراکز کے مابین LIAISON کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا تو قتل کا یہ پروگرام اس طرح سے سیٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ سازش تین صوبوں پر محیط رہی مگر کہیں سے اس کا سراغ نہیں ملا تو سراغرسانی کے محکموں کو ہی!

وزیراعظم ناظم الدین مرحوم کے خلاف سازش ہوتی ہے۔ کراچی اور واشنگٹن کے بیچ میں گورنر جنرل بوگرہ مرحوم کے مابین ٹیلیفون بازی ہوتی رہتی ہے۔ دونوں طرف کے قاصد آتے جاتے رہتے ہیں پھر بوگرہ مرحوم واشنگٹن سے چل کر مقرر وقت پر کراچی پہنچ جاتے ہیں۔ بوگرہ مرحوم وزارت خارجہ کے ملازم ہیں مگر وزارت خارجہ وزیراعظم کو اطلاع نہیں دیتی ہے کہ بوگرہ مرحوم کراچی آرہے ہیں۔ اس سے پہلے ادھر کراچی میں کئی دن سے دوڑ دھوپ رہتی ہے۔ نئے وزیروں کی بھرتی کے لیے باتیں ہوتی رہتی ہیں اور ان کو بھرتی ہونے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی اثناء میں قانون دان چمچوں سے بھی مشورے ہوتے رہتے ہیں' آخر میں ایک روز ناظم الدین کو بلا کر ڈسمس کر دیا جاتا ہے۔ وہ واپس جا کر ٹیلی فون اٹھاتے ہیں کہ ملکہ برطانیہ سے شکایت کریں کہ ان کا مقرر کردہ گورنر جنرل یہ غیر آئینی قدم اٹھا رہا ہے۔ (اس وقت تک پاکستان برطانیہ کا ڈومینین تھا اور یہاں کے گورنر جنرل کی تقرری ملکہ برطانیہ کرتی تھیں) مگر ہائے ہائے یہ ٹیلی فون ''ڈیڈ'' ہے۔ پرائم منسٹر کے گھر کی ٹیلی فون لائنیں پہلے سے کٹی پڑی ہیں!

یہ سب انتظامات ایک عرصے سے ہوتے رہے تھے' مگر کسی شخص کو بے خبر رکھا گیا تھا تو وہ پرائم منسٹر تھا جو خود سراغرسانی کے محکموں کا انچارج وزیر تھا!!

پھر ایک وقت آیا جب تیسرے پرائم منسٹر (اس مرتبہ خود بوگرہ مرحوم) پر بن آئی یعنی ان کے اور گورنر جنرل کے مابین چل جاتی ہے۔

بوگرہ مرحوم اسمبلی سے گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کرا دینے کے بعد' بحالت بے خبری بڑے اطمینان کے ساتھ امریکہ کے دورے پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے گورنر جنرل کے معتمد خاص' جنرل ایوب خان کو لگا دیا جاتا ہے۔ ادھر کراچی میں تقریباً ایک مہینے سے مختلف حلقوں کے مابین سرگوشیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہر

شخص کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ گورنر جنرل بوگرہ سے ناراض ہے اور ان کو نکالنا چاہتا ہے۔ پورا ایک مہینہ یہ قیاس آرائیاں اور شور و شر رہتا ہے مگر بوگرہ مرحوم کو کوئی خبر رساں ایجنسی یہ اطلاع نہیں دیتی ہے کہ ان کے خلاف کراچی میں یہ سازش ہو رہی ہے' وہ بے خبری کے عالم میں امریکہ کی سیر کرتے رہتے ہیں۔

اور جب وہ واپس آتے ہیں تو گورنر جنرل کے دو چوبدار لندن سے ہی ان کے ساتھ لگے آتے ہیں۔ وہ ایئرپورٹ سے سیدھا ان کو گورنر جنرل کے یہاں لے جاتے ہیں۔ جہاں چودھری محمد علی مرحوم بھی وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ گالی گلوچ ہوتے ہی پستول لہرائے جاتے ہیں۔ پاکستان کے پرائم منسٹر کی کھال کھینچی جاتی ہے اور ان کی جان بخشی تب جا کر ہوتی ہے جب وہ پارلیمینٹ کو توڑنے مرکزی کابینہ کو ازسرنو بنانے اور صوبائی وزارتوں کو برطرف کرنے کے اعلان پر دستخط کر دیتے ہیں!

وقت کے لحاظ سے یہ کاروبار ماہ ڈیڑھ ماہ تک چلتا رہتا ہے مگر ملک کا پرائم منسٹر از ابتدا تا انتہا قطعاً بے خبر! اور بے خبر کیوں؟ کس کی کوتاہی؟ کس کا عدم تعاون؟ کس کی بے وفائی؟

1954-55ء میں بنگال یعنی (مشرقی پاکستان) میں انتخابات ہونے تھے' وہاں کے عوام کا موڈ صریحاً بگڑا ہوا تھا۔ مسلم لیگ کا بیڑہ غرق ہو چکا تھا' لوگ بوگرہ اور نورالامین دونوں کی حکومتوں سے بیزار تھے۔ ایسے ماحول میں عقل کا تقاضا یہ تھا کہ حالات کو پیشگی بھانپ لیا جاتا' ان کو تیزی سے درست کرنے کا اہتمام کیا جاتا اور اس کے بعد ہی انتخاب کا اعلان ہوتا۔

مگر ہوا کیا؟

خبر رساں ایجنسیاں وزیراعظم بوگرہ کو اطمینان دلاتی رہیں کہ بنگال میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ عوام مسلم لیگ پر فریفتہ ہیں۔ مرکزی اور صوبائی وزارتیں اس قدر مقبول عام ہیں کہ ان کو نہ فضل الحق شکست دے سکتا ہے' نہ سہروردی لہٰذا الیکشن کا فوری اعلان ہو جانا چاہیے!

اعلان ہوا' انتخابات ہوئے اور نتیجہ؟ بوگرہ مرحوم اور نورالامین مرحوم دونوں کا کباڑہ!

کسی کو پوچھنے کی مہلت ہی نہیں ملی کہ خبر رساں ایجنسیوں نے پرائم منسٹر کو کیوں اندھیرے میں رکھا؟ کیا ان میں عوام کے مزاج کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی؟ تو پھر انٹیلی جنس کیسے؟ یا نہیں عمداً ان وزارتوں کی مٹی خراب کروانی تھی؟

اسکندر مرزا مرحوم کا دور آیا تو وہ ایک سال سے جمہوریت کو ختم کرنے اور مارشل لاء لگانے کی تیاریاں کرتے رہے۔ ہر صوبہ میں انہوں نے افتراق پیدا کیا' مسلم لیگ کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا۔ ایک کو دوسرے سے لڑایا۔ ایوب خان کو اپنے ساتھ ملا لیا اور سارے ملک میں اس قدر ہیجان برپا کر رکھا کہ معمولی سے معمولی عقل والا انسان بھی ان دنوں سمجھ رہا تھا کہ عنقریب کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔

اگر کسی شخص کو ان چیزوں سے آگاہ نہیں کیا گیا تو وہ وزیراعظم فیروز خان نون تھے جو مطمئن رہے کہ چونکہ خبر رساں ایجنسیاں ان کے کنٹرول میں تھیں' لہٰذا ان کو اطلاع ہوئے بغیر کوئی پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔

پھر وہ ہوا جو سب نے دیکھ لیا۔ فیروز خان نون مرحوم کا پھر کسی نے نام تک نہیں سنا۔

ایوب خان مرحوم (جس طرح پچھلے مضامین میں عرض کیا جا چکا ہے) نوکر شاہی کا لایا اور بٹھایا ہوا اولی الامر تھا اور پاور میں اس کے ساتھ نوکر شاہی کی حصہ داری تھی۔

مگر کیا آخر میں ان سے نسبتاً زیادہ وفاداری دکھائی گئی اور ان کی صحیح رہنمائی کی گئی؟

جمہوریت کو ختم کر دینے اور خود عوام سے کٹ جانے کے بعد' ایوب خان مرحوم کا بھروسہ اور مدار کاملتہً نوکر شاہی اور ان خبر رساں ایجنسیوں پر رہا۔ وہی ان کے کان' وہی ان کی آنکھیں تھیں۔ وزیر وغیرہ صرف نام کے تھے اور ان کے حلقہ خواص سے باہر رہے۔ ان کو چلانے والے یا تو محکمہ خبر رسانی کے لوگ تھے یا نوکر شاہی کے وہ آدمی جن کے اسماء گرامی اسی زمانہ میں سب کو معلوم تھے۔

انہوں نے خصوصاً خبر رساں ایجنسیوں نے' ان کو (یعنی ایوب خان کو) کیا باتیں بتائیں' ان کا دماغ کس قسم کے مواد سے بھرا' اور ان کی کیا رہنمائی فرمائی؟

یہ کہ پاکستان کے چودہ کروڑ عوام جنہوں نے اپنے سیاسی شعور اور ووٹ سے صرف چند سال پہلے یہ ریاست حاصل کی تھی' اب آزاد ہو جانے کے بعد' یکایک ہوش اور خرد کھو کر اور اپنے انسانی حقوق سے دستبردار ہو کر' بار برداری کے خچروں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ جن کی پیٹھ پر آپ جو بوجھ لادیں گے وہ خوشی سے اٹھا کر چلتے رہیں گے۔ آپ نے چونکہ اپنے کو اولی الامر بنالیا ہے' آپ ان پر اپنی منشا کے مطابق آئین نافذ کر سکتے ہیں۔ چمچوں کی پارلیمینٹ بنا سکتے ہیں' جعلی مسلم لیگ کھڑی کر سکتے ہیں۔ بی' ڈی کا ڈھکوسلا چلا سکتے ہیں' سیاستدانوں کے خلاف ایبڈو لگا سکتے ہیں' جن لوگوں نے پاکستان بنایا تھا ان کو جیلوں میں ڈال سکتے ہیں' مخلوق خدا پر تشدد کر سکتے ہیں غرض اوپر خدا نیچے آپ ہیں۔ بیچ میں پوچھنے والا کوئی نہیں۔

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
دل یہ کس کا ہے میری جان جگر کس کا ہے

میں ایوب خان مرحوم کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ وہ خود خراب آدمی نہیں تھے ان میں شرم و حیا تھی۔ عوام سے ان کی عداوت نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سیاست نہیں جانتے تھے اور ان کا اعتماد نوکر شاہی اور خبر رساں ذرائع پر تھا اگر ان کو چلانے والے یہ لوگ صحیح طور پر چلاتے اور ان کے دماغ میں یہ خرافات نہیں بھرتے تو ان سے یقیناً وہ غلطیاں سرزد نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے ان کی انتہا اچھی نہیں ہوئی۔

آخر میں اس قتل گاہ میں سادہ دل یحییٰ خان مرحوم کا قدم پڑا ع

ملامت میکند خلقے و من بردار می رقصم

وہی بیہودہ باتیں جو پہلے والوں سے کی جاتی تھیں ان سے بھی کی گئیں اور ان کو غلط راستے پر لگا دیا گیا یعنی "صدارت کا مفت کا لڈو تم خود اٹھالو' صنعتکاروں اور تاجروں سے روپیہ لے کر رشوت خور پارٹیوں پر لگاؤ ان سے الیکشن لڑواؤ' ان رشوتی پارٹیوں کے جتنے ممبر منتخب ہو کر آئیں گے' وہ آنکھیں بند کر کے آپ کو صدر بنالیں گے۔ بس محنت تھوڑی اور مزدوری زیادہ......!

اہلاً و سہلاً' فضل یا شیخ۔

اس مشورہ پر یحییٰ خان نے عمل تو کیا مگر نتیجہ الٹا نکلا اس کے بعد بھی اگر ان

کی صحیح رہنمائی ہوتی تو وہ جمہوریت کا راستہ روک کر خونریزی نہیں کراتے۔

سوال یہ ہے کہ کس ادارے نے اس غریب کو تاریکی میں رکھا اور بنگال کا مزاج سمجھنے میں ان سے غلطیاں کروائیں۔ آخر یہ ساری خبر رساں ایجنسیاں جن کا جال ملک بھر میں پھیلا رہا کیا کر رہی تھیں؟ کیا ان کو یہ نہیں بتایا کہ پاکستان کے عوام ڈنگر یا بار برداری کے خچر نہیں ہیں جو سب چیز برداشت کیے جائیں گے۔

جواب کے لیے قارئین کرام خود اپنا دماغ چلا سکتے ہیں' میں عرض کرنے سے قاصر ہوں۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ

کالا باغ کا کیریکٹر' کردار اور کنٹری بیوشن

ایوب خان مرحوم کا دور دس سال چلا اور کئی لحاظ سے سبق آموز ثابت ہوا۔ اس دور میں نوکر شاہی کے جملہ کمالات اور امکانات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ یہ لوگ کس طرح سازشیں کرتے ہیں' اپنے مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے وہ کس طرح مصلحتاً مختلف گروپوں میں بٹ جاتے ہیں اور کس طرح ان کا ہر گروپ اپنی اپنی کمین گاہ سے ایک ہی نشانہ پر تیر برساتا رہتا ہے۔ یہ لوگ زبان سے کچھ نہیں بولتے' غیر ضروری شور و غوغا سے دنیا کو اپنے عزائم سے آگاہ نہیں کرتے' چپ چاپ وہ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتے رہتے ہیں مگر آگ کی طرح نہیں سیلاب کی طرح۔

ایوب خان مرحوم کا زمانہ تین ادوار پر مشتمل رہا۔

(1) پہلا دور شروع والے ڈیڑھ دو سال کا۔

(2) دوسرا دور کالا باغ مرحوم کی گورنری والا اور

(3) تیسرا دور کالا باغ کے نکل جانے کے بعد کے دو سال کا۔

پہلے دور میں ایوب خان مرحوم کاملاً نوکر شاہی کے ہاتھ میں رہے اور اسی کے مشوروں سے اپنے راج کو مستحکم کرنے اور دوامیت بخشنے کے لیے "پلاننگ" کرتے اور پروگرام بناتے رہے۔ اس کام میں ان کے اپنے دماغ کی کارفرمائی کم' نوکر شاہی کے مشوروں کی زیادہ!

یہ پلاننگ یا پروگرام کس نوعیت کے تھے؟ اور کن اصولوں پر مبنی تھے؟......

عوام محض بار برداری کے بے زبان جانور (جس کی لاٹھی اس کی بھینس)...... جمہوریت نیست و نابود...... سیاستدانوں کا قلع قمع...... قائد کے اصول پس پشت...... تشدد...... شعبدہ بازی اور ملمع سازی...... چمچوں کی پیداواری اور ان کا استعمال......اور عقیدہ یا وہم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی خاص مصلحت کی خاطر اس مقہور ملک کو موصوف (یعنی ایوب خان) کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ بگاڑتے رہیں گے وہ بناتا رہے گا' یہ ڈبوتے رہیں گے وہ نکالتا رہے گا' یہ حماقت اور ہلاکت کا راستہ لیں گے وہ واپس اس کو شاہراہ فلاح پر ڈالتا رہے گا۔ نوکر شاہی کے کچھ خرانٹ خوابوں کے ذریعے موصول شدہ بشارتوں کی بنیاد پر ان کے دماغ میں یہ وہم پختہ کرتے رہے کہ وہ براہ راست مامور من اللہ ہیں اور ان کی ذمہ داری خلق اللہ سے ہرگز نہیں ہے۔ اس کاروبار میں چند پیشہ ور پیر اور پٹو مشائخ بھی نوکر شاہی کا ہاتھ بٹاتے رہے' جب کبھی اس وہم میں سقم واقع ہوا' ایک اور مشائخ کانفرنس بلائی گئی۔

دوسرے دور کی ابتداء کالا باغ مرحوم کی آمد سے ہوئی اور یہ صاحب تقریباً چھ سال سے ایوب خان کے نائب السلطنتہ بنے رہے۔

تیسرا دور کالا باغ مرحوم کے مستعفی ہو جانے کے بعد چلا اور دو سال کے اندر خود ایوب خان مرحوم کے خاتمہ پر ختم ہو گیا۔

میری اپنی نظر میں ان ادوار میں سے دو نمبر سب سے زیادہ اہم تھا اور اس وجہ سے اس سے وابستہ کچھ یادوں کا اعادہ مناسب رہے گا۔

نواب امیر محمد خان آف کالا باغ' جنہوں نے دوسرے نمبر دور میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اپنی جگہ پر ایک غیر معمولی انسان تھے' ان کو دیکھ کر اٹھارہویں انیسویں صدی کے نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخصیت آج کل کے ماحول کی پیداوار نہیں ہو سکتی تھی...... بڑے خوددار...... راست گو...... دوستی اور دشمنی کے پختہ...... وعدہ کے سچے...... منتظم...... منتقم...... ہاتھ صاف...... باہمت...... ضدی...... طبعاً تشدد پسند...... جفاکش...... ذاتی کیریکٹر کے لحاظ سے صاف...... شکل و شباہت میں رعب دار...... رہنے کرنے میں سادگی مگر صفائی پسند......ایک سوٹ کیس لے کر گورنر ہاؤس میں داخل ہوئے اور وہی سوٹ کیس اٹھا

کر وہاں سے چل دیئے۔

میری ان سے شناسائی 1955ء میں ہوئی جب ہم دونوں دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ میں وزیر تھا اور وہ پیچھے کی بنچوں پر بیٹھنے والے ممبر' ان کی باتیں تو مرحوم سکندر حیات خان کے زمانے سے سنتا آیا تھا مگر ان کو دیکھنے کا اتفاق اب ہوا۔ ان کی صورت اور ہیئت دیکھتے ہی میں نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ یہ شخص نہ بے مایہ ہو سکتا ہے نہ فرومایہ' لہٰذا بہ لحاظ دوستی ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے ان سے جھک کر ملنا شروع کر دیا اور ہر موقع پر ان کا احترام ملحوظ رکھا۔ چمچوں اور ہیجڑوں کی دنیا میں اگر اتفاقیہ کوئی مرد میدان نظر آ جائے تو اس سے اس کی شرائط پر ہی تعلق رکھنا پڑتا ہے چنانچہ میں نے ان کے بارے میں اسی اصول پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی مجھ پر مہربان ہو گئے اور ہمارے مابین دوستی ہو گئی (ابھی ان کی دوسری خصوصیات کھل کر سامنے نہیں آئی تھیں۔)

اسمبلی اجلاسوں میں یہ صاحب اکیلے آتے تھے۔ اکیلے جاتے تھے۔ کھانے پینے کی کسی پارٹی میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ہر وقت خاموش' پارٹی میٹنگوں سے اکثر غائب' اگر کبھی اتفاقیہ آ بھی گئے تو بُت بنے بیٹھے رہتے تھے زیادہ سے زیادہ اپنی رعب دار مونچھوں کے تاؤ کو برقرار رکھنے کے لیے انگلیاں چلاتے رہتے تھے۔ دوسرے ممبر ہم وزیروں کے آگے پیچھے دوڑتے بھاگتے اور خوشامدیں کرتے پھرتے تھے مگر یہ صاحب نہ کسی وزیر کو موجود سمجھتے تھے نہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تھے۔ ان کی اپنی ایک علیحدہ دنیا ہوتی تھی جس میں وہ رہا کرتے تھے' ان سے تعلقات کے بارے میں مَیں صرف اس قدر ترقی کر سکا تھا کہ کبھی کبھی اس دنیا کو دور دور سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ صورتحال اس وقت تک قائم رہی جب تک میں وزارت اور اسمبلی کی ممبری چھوڑ چھاڑ کر ملک سے باہر نہیں چلا گیا۔

میرے پیچھے یہاں انقلاب آ گیا' ایوب خان مرحوم اولی الامر بن کر بیٹھ گئے اور ڈیڑھ دو سال بعد کالا باغ مرحوم مغربی پاکستان کے گورنر مقرر ہو گئے۔ یہاں سے جو خبریں ہم تک پہنچتی رہیں ان سے ظاہر تھا کہ نئے گورنر نے مغربی پاکستان کی نوکر شاہی کو خوب کنٹرول میں رکھا ہے مگر مرکز کی نوکر شاہی ان کے خلاف ہو گئی ہے اور ایوب

خان کے کان بھرنے لگی ہے۔ خود مرکزی کابینہ میں بھی دو گروپ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک گروپ کالا باغ کے خلاف ہے' دوسرا موافق' کچھ عرصہ سے ان میں یہ کشمکش جاری ہے۔ ایوب خان مرحوم غریب بیچ میں پھنسے ہوئے ہیں اور دونوں گروپ ان کو اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

1964ء کے آخر میں مجھے کالا باغ مرحوم کا' ایک خاص آدمی کے ذریعہ' پیغام پہنچا کہ ان کو میری اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں فوراً لاہور آ کر ان سے ملوں۔ میں اس وقت ہانگ کانگ میں تھا۔ ان کے بلاوے کو ٹالنا مناسب نہ سمجھ کر میں ان سے آ کر ملا۔

ان کی کہانی مختصراً یہ تھی:

"میں نے ایوب خان کے ہاتھوں گورنر بننا اس خیال سے منظور کیا تھا کہ میں اس شخص کو نوکر شاہی کے نرغہ میں سے نکالنا چاہتا تھا۔ ایوب خان کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ بات واضح ہونے لگی تھی کہ انتظامی امور میں ان کی ناتجربہ کاری کا فائدہ اٹھا کر نوکر شاہی ایوب خان پر گھیرا ڈال کر ان کو غلط راستوں پر چلانے میں مصروف ہے۔ یہ صورتحال کوئی عزت پسند شہری برداشت نہیں کر سکتا۔ گورنر بن جانے کے بعد میں نے اپنی صوبائی نوکر شاہی کو تو ڈنڈے کے زور سے اپنے قبضہ میں کر لیا مگر مرکز میں ایوب خان پر بدستور نوکر شاہی کے ایک گروپ کا تسلط قائم رہا جو ان کے متعلقین میں سے کچھ آدمیوں اور بعض سیاسی چمچوں سے مل کر ان سے ایسے کام کراتا رہا ہے جو میرے ضمیر اور طبیعت کے سراسر خلاف ہیں۔ میں احتجاج کرتا رہا ہوں مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں مستعفی ہو کر علیحدہ ہو جاؤں مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جس سے ایوب خان تکلیف میں آ جاتے ہیں۔ اور میں اس حالت میں ان کو چھوڑ کر بھاگ جانا گوارا نہیں کر سکا ہوں۔ اس سے میری مردانگی اور کیریکٹر پر دھبہ آ جانے کا احتمال تھا۔ حال ہی میں ان کا مس جناح سے مقابلہ ہوا' ایسے وقت میں میں ان کو چھوڑ جاتا تو بزدل شمار ہوتا' لہٰذا میں اپنی طبیعت پر انتہائی بوجھ ڈال کر اسی کے ساتھ لگا رہا مگر اس مقابلے سے باعزت نکل آنے کے بعد بھی ان کی سمجھ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ان کو نوکر شاہی کے مشیر اپنے مطلب کے لیے

ہلاکت کی طرف کھینچے چلے جا رہے ہیں اور وہ خود کوئی عقل کی بات نہیں سنتے۔ ہر طرف خرابی ہے۔ صنعت کار' تاجر اور کچھ اور لوگ نوکر شاہی سے مل کر بے تحاشا لوٹ مار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے صوبے کے لوگوں پر تشدد کر کے ان کو ان کی مرضی کے خلاف ایوب خان کے پیچھے لگائے رکھا۔ لوگوں کے لیے میں اتنا کچھ کر سکا ہوں کہ میں نے ملکی نظم و نسق کو اس افراتفری سے متاثر ہونے نہیں دیا ہے۔ نوکر شاہی کے شتر بے مہار کی ناک میں وزنی نکیل ڈالے رکھتا ہوں' جرائم پیشہ لوگوں کے حوصلے بڑھنے نہیں دیتا ہوں' امن و امان کو بحال رکھے بیٹھا ہوں' مگر اب میں تھک گیا ہوں۔ ایوب خان مردم شناس نہیں ہے اور نہ اس میں شکر گزاری کا مادہ ہے۔"

کالا باغ مرحوم کی یہ تقریر سننے کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ "پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟"

کالا باغ: "مشورہ دو کہ اب کیا کیا جائے مشورہ بھی ایسا ہو کہ میں نکل بھی جاؤں اور میری وفا کیشی اور مردانگی پر کوئی حرف بھی نہ آنے پائے۔"

میں نے عرض کیا کہ میں کئی سال سے ملک سے باہر رہا ہوں اور یہاں کے حالات سے قطعاً بے خبر ہوں۔ اب جب تک میں حالات کا خود مطالعہ نہ کرلوں اور اطمینان نہ کرلوں کہ جو کچھ خیال آپ نے ظاہر کیا ہے وہ حالات سے مطابقت رکھتا ہے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا ہوں سوائے اس کے کہ آپ جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ع

مرغ زیرک چوں بہ دام افتد تحمل بایدش

ان سے رخصت لے کر میں ملک میں پھرتا اور حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ خود ایوب خان سے بھی دو چار مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔

ابھی چند مہینے گزرے تھے کہ 1965ء والی لڑائی شروع ہو گئی۔

لڑائی کے بعد جب کالا باغ مرحوم سے ملا تو انہوں نے یہ قصہ بیان کیا۔

"میں نتھیا گلی میں تھا جب مجھے خبر ملی کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور لاہور خطرے میں ہے۔ میں اسی گھڑی موٹر میں بیٹھ کر لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں راولپنڈی میں ایوب خان سے ملا۔ انہوں نے لاہور جانے سے مجھے روکنے کی

کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ لاہور شہر پر بم برس رہے ہوں گے اور لاہور کا راستہ بھی اب تک کٹ گیا ہو گا۔ ممکن ہے کہ میں راستے میں ہی مارا جاؤں یا پکڑا جاؤں۔ میں نے ایوب خان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے کہا کہ بزدلی کا عنصر میرے خون میں ہی نہیں ہے۔ میں گورنر ہوں اور میرا موقع پر موجود رہ کر اپنے لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک رہنا میرا فرض ہے۔ میں لازماً ابھی ابھی لاہور جاؤں گا۔ اگر دشمن لاہور میں گھس آیا تو میں خود بندوق اٹھا کر اس کا مقابلہ کروں گا اور لڑتے لڑتے مر جاؤں گا اور میری لاش دشمن کو گورنر ہاؤس کی سیڑھیوں پر سے اٹھانی پڑے گی۔ بصورت دیگر اگر لاہور جاتے ہوئے راستہ میں ہی مجھ پر حملہ ہوا تو میں وہیں لڑ کر اور اپنی جان قربان کر کے اپنا فرض پورا کرلوں گا۔ کسی صورت میں دشمن کو یہ کہنے کا موقع نہیں دوں گا کہ مغربی پاکستان کا گورنر بزدل اور موت سے ڈرنے والا شخص تھا۔ چنانچہ میں نے ایوب خان کی بات نہیں مانی اور آگے لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں تو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا مگر لاہور پہنچ کر کیا دیکھا؟ یہ دیکھا کہ حکومت کے بڑے بڑے سیکرٹری صاحبان اپنے عملے سمیت ٹیبلوں اور میزوں کے نیچے پیٹ کے بل لیٹے پڑے ہیں۔ انہوں نے سنا ہوا تھا کہ بم گولوں سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ آدمی کسی میز کے نیچے پیٹ کے بل الٹا لیٹا رہے اور وہ اس اصول پر عمل فرما رہے تھے۔ کیا مضحکہ انگیز صورت تھی؟ مغربی پاکستان کی سرکار ٹیبلوں کے نیچے! میں نے ان کو شرم دلائی اور ڈرا دھمکا کر باہر نکل کر کام کرنے پر مجبور کر دیا۔"

میں نے لڑائی کا پس منظر پوچھا تو انہوں نے کہا۔

بھارت کی نیت کئی دنوں سے ہم پر حملہ آور ہونے کی تھی۔ مگر ایوب خان کے مشیروں نے ان کو خراب کرانے کے لیے' یہ تین باتیں ان کو بتا رکھی تھیں۔

(1) رن کچھ والی گڑبڑ کے بعد یہ جو بھارت کے وزیراعظم شاستری کہتے رہے تھے کہ اس مرتبہ پاکستان پر حملے کی جگہ وہ خود منتخب کرے گا تو یہ خالی گیدڑ بھبکی ہے' اس کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

(2) بھارت کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ بین الاقوامی سرحد لتاڑ کر پاکستان پر حملہ آور ہو سکے۔

(3) کشمیر کے عوام بھارت سے تنگ آ چکے ہیں اور بغاوت کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ صرف نعرۂ تکبیر سننے کے منتظر ہیں۔ اس صورتحال کا بھارت والوں کو بھی پورا پورا پتہ ہے اور وہ اس اندرونی بغاوت کی خاطر بھی پاکستان کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔

یہ اندازہ ہر لحاظ سے غلط تھا اور محض اس وجہ سے ایوب خان کو طفل تسلیاں دی جا رہی تھیں کہ وہ جب کسی اور طریقہ سے نکالا نہیں جا سکتا تھا تو کسی لڑائی میں ہی پھنس کر اپنا خاتمہ کرا لے۔ اب تک نوکر شاہی کا ایک فعال گروپ ایوب خان سے مایوس ہو چکا تھا اور وہ اس کو نکلوانے کے درپے تھا۔ دوستی کے پردہ میں وہ اس سے دشمنی کرنا چاہتا تھا۔

مگر آخر میں یہ مقصد نوکر شاہی کا اس وجہ سے پورا نہیں ہو سکا کہ پاکستان کو لڑائی میں شکست کھانی نہیں پڑی کیونکہ:

(1) پاکستان کی افواج بڑی بے جگری اور معیاری بہادری سے لڑیں۔

(2) فوج اور ملکی عوام کے مابین تعلقات خوشگوار تھے اور عوام نے دل کھول کر فوج سے تعاون کیا۔

(3) بین الاقوامی دباؤ کے تحت جلد ہی سیز فائر ہو گیا۔

یہ تھی 1965ء والی کی کہانی جو میں نے کالا باغ مرحوم کی زبانی سنی۔

کراچی میں ایک اسمبلی سیٹ کے لیے بائے الیکشن ہوا اور ایوب خان کا ٹکٹ یافتہ امیدوار گر گیا۔ نوکر شاہی نے ایوب خان کے کان بھرے کہ یہ شکست کالا باغ نے اپنے وزیروں اور افسروں کے ذریعے کھلوائی ہے تاکہ وہ (ایوب خان) دنیا کے سامنے رسوا اور بے آبرو ہو۔

میں اس موقع پر بھی لاہور ہی میں تھا۔ ایک دن علی الصباح کالا باغ مرحوم کا قاصد یہ پیغام لے کر آ پہنچا کہ میں ان سے اسی وقت جا کر مل لوں۔

میں ان سے ملا تو انہوں نے یہ قصہ کہا۔

"کراچی کے بائے الیکشن کے بارے میں ایوب خان کے درباریوں نے مجھ پر یہ الزام لگا کر کہ اس شکست کا ذمہ دار میں ہوں' ان کو میرے خلاف خوب بھڑکایا ہے۔

کل میرے دوست شعیب فنانس منسٹر نے پیغام بھیجا ہے کہ ایوب خان مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ اگلے چند روز میں جب میں ان سے کوئٹہ میں ملوں گا تو ممکن ہے کہ وہ مجھ سے سخت کلامی کریں۔ شعیب کا مشورہ ہے کہ اگر ایوب خان مجھے برا بھلا کہیں تو میں طیش میں نہ آؤں بلکہ تحمل اور بردباری سے کام لوں یا پھر سرے سے میں کوئٹہ ہی نہ جاؤں تاکہ ایوب خان سے تصادم نہ ہو۔ میں نے شعیب صاحب کو یہ کہلوا بھیجا ہے کہ میں بزدل نہیں ہوں کہ کوئٹہ ہی نہ جاؤں۔ البتہ پستول اپنے پاس رکھوں گا' اگر ایوب خان نے مجھے ناقابل برداشت گالی دی اور مجھے بے آبرو کرنے کی کوشش کی تو میں ان کو اسی وقت پستول سے مار ڈالوں گا۔"

اب مجھ سے پوچھا کہ یہ کہانی سننے کے بعد میری رائے کیا ہے؟

میں نے کہا کہ "آپ کوئٹہ نہ جائیں اور اگر جائیں بھی تو یہ پستول والے پروگرام پر عمل نہ فرمائیں۔" میں نے ان کو نپولین اور ٹیلراں کا واقعہ سنایا۔ ٹیلراں نپولین کا وزیر خارجہ تھا۔ ایک روز نپولین اس سے خفا ہو گیا اور بھری محفل میں اس کو سخت گالیاں سنائیں۔ ٹیلراں گالیاں سنتا رہا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ محفل ختم ہو جانے کے بعد ٹیلراں دوسرے درباریوں کے ساتھ محل سے باہر نکل رہا تھا تو کسی نے اس سے پوچھا کہ اتنی گالیاں سننے کے بعد وہ کیسے خاموش رہ سکا؟ ٹیلراں کا جواب یہ تھا جو تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے۔ "کتنا بڑا آدمی اور کس قدر ناقص اس کی ابتدائی پرورش۔"

(WHAT A GREAT MAN AND HOW ILL-BRED)

وقت گزرنے کے ساتھ وقت نے خود انتظام کر لیا۔ نپولین شکست کھا کر جلاوطنی کی حالت میں مر گیا۔ ٹیلراں اس کے بعد بھی سالہا سال بڑے بڑے مناصب پر فائز رہا۔ انسانی تاریخ کا سبق یہ ہے کہ "بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کی بدکلامی یا اشتعال انگیزی کی وجہ سے اپنے کپڑے اتار نہیں پھینکتے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں واپس آ گیا۔ دوسرے روز سنا کہ نواب صاحب کوئٹہ روانہ ہو گئے۔ تین چار دن کے بعد وہ واپس آئے اور بتایا کہ "میں پستول لے کر کوئٹہ پہنچا تھا مگر وہاں سب خیریت رہی۔ ایوب خان نے میرے منصب کو ملحوظ رکھا اور کسی خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ بائے الیکشن کا ذکر تک نہیں چھیڑا۔ البتہ آخری روز انہوں نے جیب

سے ایک کاغذ نکال کر خاموشی سے میرے ہاتھ میں تھمادیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ ایوب خان کے امیدوار کو کتنے ووٹ ملے تھے اور اس کے مخالف کو کتنے؟ چنانچہ ایوب خان کے اس سلوک کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جن دو صوبائی وزیروں پر یہ الزام آیا ہے کہ انہوں نے ایوب خان کے امیدوار کے خلاف کام کیا تھا' ان سے استعفیٰ لے کر ایوب خان کو بھیج دوں گا اور اس طرح سے ان کی تالیف قلب کروں گا۔ شرافت کا جواب شرافت!"

کالاباغ

جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا' نواب کالاباغ مرحوم اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے مابین شروع سے اختلافات رہے۔ بھٹو مرحوم ایوب خان مرحوم کے وزیر تھے اور کالاباغ مرحوم مغربی پاکستان کے گورنر۔ اختلافات کے اسباب کیا تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ دونوں میں اس بات پر کمپیٹیشن تھا کہ ان میں سے کس کو ایوب خان کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل رہتا ہے اور پھر مغربی پاکستان کے انتظام کا مسئلہ بھی شاید درمیان میں تھا۔ دونوں چاہتے تھے کہ اس میں اس کا زیادہ سے زیادہ عمل دخل ہو۔ میں اتنا معلوم کر سکا تھا کہ اس مسئلہ میں کالاباغ مرحوم بے انتہا حساس تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ صوبہ کے انتظامی امور میں کوئی اور شخص دخل دے۔ اس وجہ سے غالباً ان کے اور ایوب خان مرحوم کے عزیزوں کے مابین بھی بدمزگی رہتی تھی۔ بہر حال بھٹو اور کالاباغ کے باہمی تعلقات کی خرابی' آخری دنوں میں' ذاتی دشمنی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

معاہدۂ تاشقند کے بعد خود ایوب خان مرحوم' بھٹو صاحب سے بدظن ہو گئے تھے اور ان کو جلد ہی اپنی کابینہ سے علیحدہ کر دیا۔ بھٹو صاحب کو یہ احساس ہو گیا کہ اب ایوب خان ان کو تکلیف دینے کی کوشش کریں گے اور اس کام کے لیے ان کے دشمن کالاباغ کو استعمال کریں گے۔ یہ واقعہ تھا کہ کالاباغ دشمنی اور انتقام کے معاملے میں ایک سخت انسان کے مشہور ہو چکے تھے۔

چنانچہ بھٹو صاحب وہاں سے سبکدوش ہوتے ہی سیدھے لاہور آئے۔ ریلوے اسٹیشن پر طالب علموں نے ان کا پرزور استقبال کیا اور استقبالی ہجوم کی بے تابی کے نشان ان کے کپڑوں اور جسم پر رہ گئے...... اسی حال میں وہ کالاباغ کے دروازے پر پہنچ گئے اور معمولی ملاقاتیوں کی طرح رپورٹ کروائی۔ کالاباغ نے فوراً ان کو اندر بلالیا۔ انتہائی شفقت برتی' نہلوایا' دھلوایا' کپڑے بدلوائے' لنچ کھلوایا اور اس یقین دہانی سے ان کو رخصت کیا:

"کہ چونکہ اب تم میرے دروازے پر آگئے ہو میں نے ہر چیز فراموش کردی۔ اس کے بعد میرے ہاتھ سے تم کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔"

ہو سکتا ہے کہ ایوب خان مرحوم نے یہ سمجھ رکھا ہو کہ اب کالاباغ خود بخود اپنے دشمن بھٹو کی خبر لیں گے اور ان کی مُرلی بند رکھیں گے' مگر یہ نہیں ہوا' بھٹو اپنا کام کرتے پھرے اور کالاباغ قطعاً خاموش رہے۔

کچھ عرصہ کے بعد خود کالاباغ بھی استعفیٰ دے کر ایوب خان سے علیحدہ ہوگئے۔

آخری دنوں میں ایوب خان مرحوم سے میری ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ دشمنوں کے گھیرے میں آچکے تھے اور ان کے چہرے و گفتگو سے ان کی پریشانی ظاہر تھی۔ مجھ سے پوچھا کہ: "تم سیاسی آدمی ہو' تمہارے خیال میں میں اس پریشانی میں کیوں اور کس طرح پھنسا؟"

میں نے کہا: "کالاباغ مرحوم کو نکال کر۔" (اس اثناء میں کالاباغ مرحوم قتل ہو چکے تھے۔)

ایوب خان: "میں ان کو کس طرح نہیں نکالتا۔ وہ تو میرے دشمن بھٹو کو سب چیزیں معاف کر کے ان کے ہمدرد بن چکے تھے۔"

میں خاموش رہ گیا۔

1973ء میں خود بھٹو مرحوم سے اس موضوع پر مختصر سی بات ہوئی۔ کالاباغ کا نام آیا تو انہوں نے ان کے بارے میں کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے جھٹ سے کہہ دیا۔ مگر انہوں نے تو آپ پر احسان کیا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد انہوں نے ایوب خان کی کدورت مول لے لی مگر آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔"

بھٹو مرحوم: "ہاں یہ ان کی فیوڈل کمزوری تھی۔"

شروع 1966ء میں ایوب خان مرحوم نے مجھے راولپنڈی بلا کر کہا کہ وہ چند دنوں میں ڈھاکہ جائیں گے تاکہ مشرقی پاکستان کی گڑبڑ کے اصلی اسباب معلوم کر سکیں۔ انہوں نے مجھے دعوت دی کہ اس سفر میں مَیں بھی ان کے ساتھ جاؤں اور وہاں کے سیاسی حالات سمجھنے میں ان کی مدد کروں۔ میں نے ہاں کر دی۔

یہ قافلہ لاہور ایئرپورٹ سے روانہ ہونے والا تھا۔ لہٰذا میں وہاں پہلے سے پہنچ گیا۔ کالاباغ سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو یہ کیفیت بتادی۔ انہوں نے کہا میں ڈھاکہ جاؤں مگر ایوب خان کے ساتھ ایک ہی جہاز میں سفر نہ کروں کیونکہ موت ہر وقت ڈکٹیٹروں کے پیچھے لگی پھرتی ہے اور میرے جیسا بے گناہ بھی خواہ مخواہ کہیں بیچ میں نہ مارا جائے۔

میں نے پوچھا: "کوئی خاص خطرہ ہے کیا؟"

کالاباغ: "نہیں' مگر یہ اصول کی بات ہے اور ہر وقت ملحوظ رہنی چاہیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب ڈکٹیٹروں کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو ان کے ساتھ کئی بے گناہ بھی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔"

میں نے اپنی سیٹ دوسرے جہاز میں بک کرالی اور ایوب خان سے پہلے ڈھاکہ پہنچ گیا۔

اس موقع پر کالاباغ مرحوم سے ایک اور بات بھی ہوئی جس کی بنیاد یا وجہ میں آج تک سمجھ نہیں سکا۔

میں نے جب ان کو بتایا کہ مجھے ایوب خان مرحوم کیوں ڈھاکہ لے جانا چاہتے ہیں تو اس پر مرحوم نے کہا کہ "بھائی' تم بھی یہی رائے دے دینا کہ مشرقی پاکستان کو اب علیحدہ کر دینا چاہیے۔"

میں نے پوچھا: "یہ کیوں؟ کیا یہی یہاں کے لوگوں کا فیصلہ ہے؟"

جواب یہ تھا: "یہ فیصلہ مرکز کی نوکر شاہی کا ہے جس کا قبضہ ایوب خان پر ہے۔ وہ پاکستان کو اپنی ریاست بنانی چاہتی ہے اور اس کام میں اس کو مشرقی پاکستان سے مزاحمت کا اندیشہ ہے اور اس لیے ان کو جدا کرنا چاہتی ہے۔ شروع سے ہی اس نے

بنگالیوں سے بگاڑ رکھا ہے۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ کر ان کے سامنے پاکستان کا ایسا امیج (IMAGE) پیش کیا ہے کہ وہاں کے حساس سیاستدان ڈر گئے ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ حال ہی میں مجیب الرحمٰن سے جو چھ پوائنٹ منسوب کیے گئے ہیں' ان کا حقیقی خالق کون تھا؟ مرکز کی نوکر شاہی کے بعض آدمی! چودھری محمد علی نے حال ہی میں لاہور میں سیاستدانوں کی کانفرنس بلائی تھی اور وہاں کچھ ایسی باتیں ہوئی تھیں کہ مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستان کی قیادت کی نیت پر شک گزرا اور وہ کانفرنس سے واک آؤٹ کر گئے وہ جیسے ہی کانفرنس سے باہر آئے' ان کے ہاتھوں میں چھ پوائنٹوں والا مسودہ تھما دیا گیا اور وہیں سے طوفان شروع ہو گیا۔ اب دو سمتوں میں کام چلے گا۔ ایک طرف ایوب خان کو یہ مشورہ دیا جائے گا کہ بنگالیوں پر تشدد کیا جائے تاکہ ان میں اشتعال پیدا ہو اور دوسری طرف بنگالیوں کو بھڑکانے کے لیے بالواسطہ کوششیں کی جائیں گی (اس سلسلے میں کالاباغ نے ڈھاکہ کے ایک ایڈیٹر کا نام بھی لیا جو ان کے کہنے کے مطابق طرفین سے ملا ہوا تھا۔)''

آخر میں کہا: ''اس مہم کا تم کہاں تک مقابلہ کر سکو گے؟ ہر ایک کو اس کے حال پر چھوڑ دو' نہیں تو خون خرابہ زیادہ ہو گا۔''

میں ڈھاکہ گیا حالات کا مطالعہ کیا' مگر ایوب خان سے کسی رائے کا اظہار نہیں کر سکا کیونکہ انہوں نے پھر مجھ سے پوچھا ہی نہیں' معلوم ہوا ان کے درباریوں نے ان پر ورک کیا تھا کہ وہ میری رائے نہ لیں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا' چنانچہ میں ہر ایک کو حوالۂ تقدیر کر کے واپس آ گیا۔

اب میں ڈیڑھ سال کے حالات دیکھنے کے بعد اس فیصلے کو پہنچ چکا تھا کہ کالاباغ سے کہہ دوں کہ وقت آ گیا ہے کہ وہ استعفیٰ دے کر اپنے گھر چلے جائیں اور زیادہ وقت ایوب خان کے آلہ کار رہ کر لوگوں کو نہ ستائیں۔ مجھے یقین تھا کہ ایوب خان ان کے جانے کے بعد خود بخود گر جائیں گے۔

میں نے اس کے بعد پہلی ملاقات میں ہی ان کو یہ مشورہ دے دیا اور کافی دلائل کے ساتھ ...... وہ خود بھی یہ سارا عرصہ ایوب خان کی شکایتیں کرتے رہے تھے' مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی ان سے ملا اور انہوں نے ایوب خان کی شکایت نہیں کی۔ ان کو موصوف

سے کوئی ذاتی گزند نہیں پہنچی تھی۔ وہ صرف ان کی غلط پالیسیوں اور بعض غلط آدمیوں کے ان پر اثر کے شاکی تھے۔ میں نہیں کہوں گا کہ ان کی دل گرفتگی کا سبب یہ تھا کہ ایوب خان جمہوریت کے دشمن تھے۔ جمہوریت کے قائل تو مزاجاً نواب صاحب خود بھی نہیں تھے۔ البتہ ان میں اختلاف کا باعث ایوب خان کی وہ انتظامی پالیسیاں تھیں جو نواب صاحب کے خیال کے مطابق وہ بعض نوکر شاہی کے آدمیوں کے اثر کے تحت بناتے رہتے تھے۔ نواب صاحب نے انگریز کے زمانے کا انتظام دیکھا ہوا تھا ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کا انتظام بھی ویسا ہی صاف ستھرا اور مضبوط اور اصولوں پر مبنی رہے مگر اس مقصد کے حصول میں وہ ایوب خان اور ان کے مشیروں اور متعلقین کو مخل پاتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی ان کی دل آزردگی کی۔ ذاتی غرض نواب صاحب کی' جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا کوئی نہیں تھی۔ وہ نہ اپنی جاگیر کا رقبہ بڑھانا چاہتے تھے' نہ ان کو کسی مالی منفعت حاصل کرنے کی خواہش تھی بلکہ میں نے تو یہاں تک بھی سنا کہ گورنر بن جانے کے بعد وہ اپنے اہل خاندان کو بھی بے تکلف اپنے یہاں آنے نہیں دیتے تھے تاکہ وہ باہر جا کر ان کے نام پر کوئی فائدہ نہ حاصل کر سکیں۔ ان کی اپنی ضروریات' بظاہر' بالکل محدود تھیں' سادہ رہتے تھے' سادہ پہنتے تھے' سادہ کھانا کھاتے تھے۔ میں نے چند مرتبہ ان کے ہاں کھانا کھایا۔ ان کے بیڈ روم میں' جو دفتر والے کمرے کے اوپر تھا۔ چھوٹا سا ٹیبل لگا تھا' جس پر کھانا رکھ کر ملازم باہر چلا جاتا تھا۔ دو ایک ترکاری کے ڈش' شوربہ کا پیالہ' چپاتی اور پانی! رہائش بھی گورنر ہاؤس کی بڑی بلڈنگ میں نہیں تھی۔ باہر کے جس ''ونگ'' میں ان کا دفتر تھا' اسی کے اوپر ان کے رہنے کا کمرہ بھی تھا۔ وہاں ایک سوٹ کیس غسل خانہ کے دروازے کے ساتھ پڑا رہتا تھا جس میں ان کے کپڑے ہوتے تھے۔ میں نے اسی گورنر ہاؤس میں دوسرے دیسی گورنروں کو بھی دیکھا اور کبھی کبھی خود بھی وہاں مہمان رہا۔ کیا ٹھاٹ باٹ تھے' ان کے زمانے میں؟ وہ لوگ پرانے دور کے انگریز گورنروں' جن کو ''لاٹ صاحب'' کہا جاتا تھا والی طرز زندگی اختیار کیے رہتے تھے اور ان کی نقالی کرتے تھے۔ مقابلتاً نواب صاحب کی طرز رہائش ایک عام شہری کی سی ہوتی تھی۔ البتہ اس قدر سادگی کے باوجود ان کے اپنے چہرے میں اتنا رعب تھا کہ میں نے بڑے بڑے لوگوں کو ان کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتے' کانپتے دیکھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''رعب' وقار اور وقعت کی جڑ فرد

کے اپنے کیریکٹر کی مضبوطی اور صفائی ہوتی ہے۔ کمزور کیریکٹر اور ذاتی اغراض کے مارے ہوئے انسان کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ خالی باہر کی نمائش سے کیا بنتا ہے؟" اس شخص کی طبیعت میں سفلگی، منافقت اور ہلکا پن وگھٹیا پن نہیں تھا۔ ان کا اندر باہر ایک تھا۔

میرا خیال تھا کہ ان کو گورنر کی حیثیت میں کئی ایسے کام کرنے پڑے تھے جو ان کو نہیں کرنے چاہیے تھے مگر غالباً وہ ایوب خان سے وفاداری کے تقاضوں کے سامنے مجبور تھے۔ ان کی طبیعت کی ساخت بنیادی طور پر ایک فیوڈل لارڈ کی سی تھی اور یہی وجہ تھی اس کمزوری کی گو کہ فیوڈلوں کا زمانہ بیت چکا تھا مگر یہ فیوڈل بدلنے سے معذور تھے۔ آج سے سو سال پہلے تو ایسے فیوڈل عام تھے مگر ہمارے زمانے میں یہ اس جنس کا آخری سیمپل رہ گیا تھا۔ ویسے نام کے نواب تو اب بھی بہت تھے مگر پرانے قسم کے نواب یہ ایک ہی تھے۔

اگست 1966ء میں دو تین بار میں نے ان سے کہا کہ "آپ کے منہ سے ایوب خان کی شکایتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ کیوں نہیں اب اللہ کا نام لے کر اس گورکھ دھندے سے نجات حاصل کر لیتے؟ کام ایوب خان کا کرتے ہو اور بدنام خود ہوتے ہو؟"

3 ستمبر کی صبح کو ان کا بلاوا آیا۔ میں اسی وقت گورنر ہاؤس پہنچ گیا۔ وہ آج مسکرا رہے تھے جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ میں نے پوچھا: "اس بے تکلفی اور یاد آوری کا سبب؟"

کہا: "تم ہمیشہ کہتے تھے کہ استعفیٰ دو، استعفیٰ دو، آج استعفیٰ بھیج رہا ہوں اور اس لیے ٹھہرا ہوا تھا کہ تم آجاؤ تاکہ تمہارے سامنے اس لیٹر پر دستخط کروں۔"

دفتر سے ٹائپ شدہ لیٹر اندر آیا اور دستخط ہو گئے...... ایک خاص آدمی لیٹر لے کر بذریعہ ہوائی جہاز راولپنڈی روانہ ہو گیا۔

شام کی ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ "خط ایوب خان کو مل گیا اور انہوں نے اس وقت ٹیلی فون پر منتیں کیں کہ استعفیٰ واپس لو، مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مردوں کے استعفے دکھانے، ڈرانے یا واپس لینے کے لیے نہیں ہوتے۔ بڑی منت سماجت کے بعد انہوں نے کہا کہ چند دنوں میں، ان کے یہاں گورنروں کی کانفرنس ہو

رہی ہے، میں اس کانفرنس کے موقع پر راولپنڈی آؤں اور کم از کم ان کی بات سن لوں اور جب تک یہ نہ ہو استعفیٰ کی خبر پریس کو نہ دوں۔ ان کی یہ درخواست میں نے مان لی ہے۔ میں 15 تاریخ کو وہاں جاؤں گا اور وہاں سے سیدھا گھر چلا جاؤں گا۔"

میں نے کہا: "اب نوکر شاہی آپ کی گرفت سے آزاد ہو کر ایوب خان کی خوب خبر لے گی اور ان کا حال وہی کرے گی جو چیانگ کائی شیک، زار روس اور فرانس کے لوئی 16 کا کیا۔ ہر طرف بدنظمی، بدعنوانی اور رشوت خوری پھیل جائے گی اور اس ساری خرابی کا بوجھ اب ایوب خان کے سر ہوگا کیونکہ شخصی حکمرانی میں یہی ہوتا ہے۔ خرابیاں کرتے ہیں زیردست اور ذمہ دار آتی ہے اس شخص پر جو زمام اختیار اپنے ہاتھوں میں لیے اوپر بیٹھا ہوتا ہے۔ اگر جمہوریت ہو تو یہ ذمہ داری ایک شخص پر نہیں آتی۔ منتشر ہو کر مختلف اداروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

نواب صاحب ذہنی طور پر اب جملہ ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگے تھے اور اس وجہ سے آج کی ان کی گفتگو کے انداز کچھ اور ہی تھے۔

راولپنڈی کی سرگزشت میں نے اور لوگوں سے سنی۔

کہتے ہیں کہ نواب صاحب اپنے استعفے پر قائم رہے اور ایوب خان کی تقریروں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

رخصت کے وقت دو باتیں ہوئیں۔

(1) ایوب خان، بطور یادگار ان کو ایک تلوار دینا چاہتے تھے جو تحفہ انہوں نے قبول نہیں کیا۔

(2) ایوب خان گلے لگا کر اور سینہ سے سینہ ملا کر ان کو رخصت کرنا چاہتے تھے مگر نواب صاحب نے اپنے ہاتھوں سے ان کو اپنے سے دور رکھا اور کہا: "اب وہ زمانہ ختم ہو گیا۔" اور یہ کہہ کر باہر نکل آئے۔

تیرہ مہینے بعد نواب صاحب قتل!

تیس مہینے بعد ایوب خان کی ڈکٹیٹری ختم!!

ع مختصر شد قصہ ورنہ درد سر بسیار بود

گورمانی مرحوم کا کردار اور نوکر شاہی کے ہاتھوں اس کا انجام

خبر نہیں پنجاب میں مرحوم و مغفور نواب مشتاق احمد خان گورمانی کی سوانح حیات مرتب کرنے کے لیے کوئی کام کر رہا ہے یا نہیں۔ اگر یہ کام کسی وجہ سے اس وقت سرانجام نہیں ہو سکا تو پاکستان کی ابتدائی تاریخ میں بڑا خلا رہ جائے گا۔

نواب صاحب مرحوم کا 1937ء سے 1957ء تک پاکستان کے سیاسی کاروبار میں اہم اور مؤثر کردار رہا۔ انہوں نے اس ملک کے بنانے میں حصہ لیا۔ ملک بنتے دیکھا' ملک بن جانے کے بعد اس کی سیاست میں بھرپور حصہ لیا۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اپنے ہاتھوں سے ون یونٹ بنایا اور خود اس کے پہلے گورنر بنے۔ کئی مرکزی اور صوبائی وزارتوں کو بنوایا اور تڑوایا۔ کئی ہمعصر سیاست کاروں کو زیر وزبر کیا۔ سیاسی جوڑ توڑ میں ان کے مقابلے کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ ان کی پس پردہ منصوبہ بندی بلاخیز ہوتی تھی۔ عوامی ہنگاموں اور ہنگامہ آرائیوں سے دور رہے۔ مگر اس کے باوجود ایسے عہدے حاصل کرتے رہے جو عوام کی تائید کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتے تھے۔ سر فضل حسین مرحوم' سر شفیع مرحوم اور سکندر حیات مرحوم جیسے سیاستدانوں کی صحبت میں رہ چکے تھے اور ان کی سیاسی اور انتظامی ٹیکنیک اپنائے ہوئے تھے۔ اکثر مسائل میں ان کا اپروچ بیوروکریٹک ہوتا تھا اور اعداد و شمار FACTS AND FIGURES کو بڑی تندہی سے ورک آؤٹ کرتے تھے اور ان کے استعمال کا فن جانتے تھے۔ سلجھے ہوئے پارلیمنٹرین تھے' تقریر مدلل کرتے تھے' دوران پارلیمانی مباحث تلخ سے تلخ مواقع پر بھی نہ کسی پر

ذاتی حملہ کرتے تھے نہ کسی کی دل آزاری کرتے تھے۔ اپنے جذبات پر قابو تھا' ان کا چہرہ ان کی دلی کیفیتوں کی غمازی سے قاصر رہتا تھا۔ کافی پڑھے لکھے انسان تھے۔ کتب بینی کا شوق تھا۔ خوش ذوق اور خوش پوش تھے۔ بعض چیزوں میں "نیچر" کی ممسکی کا "آرٹ" سے ازالہ کر سکتے تھے۔ مجموعی طور پر وہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری" کا مصداق تھے۔

پس اگر اس قدر پہلودار شخصیت کے حالات کتابی صورت میں نئی نسل کے سامنے نہ آ سکے تو میری نظر میں یہ ایک عظیم المیہ ہوگا۔ ان جیسا آدمی اگر انگلستان' امریکہ یا فرانس کے حصے میں آیا ہوتا تو آج تک درجنوں کتابیں ان کی لائف پر چھپ چکی ہوتیں۔ آخری دنوں میں انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ وہ اپنی یادداشتیں مرتب کر رہے ہیں اور ان کے سلسلے میں کچھ باتیں بھی مجھ سے پوچھی تھیں مگر خبر نہیں وہ یہ کام پورا کر سکے تھے یا نہیں۔

میرے اس سلسلۂ مضامین کا تعلق ویسے تو پاکستان میں نوکر شاہی کے کردار سے ہے' مگر ضمنی طور پر نواب صاحب کے رول کا ذکر کرنا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

یہ صاحب خود مزاجاً نیم بیوروکریٹ تھے۔ انگریز کے زمانے میں سیکرٹری فوجی بحالیات اور بہاولپور کے پرائم منسٹر رہ چکے تھے۔ ساری عمر انہوں نے نوکر شاہی سے تعاون کیا اور کسی موقع پر بھی اس کے سیاسی عزائم کی تکمیل میں حائل نہیں ہوئے۔ ہمیشہ اس کی مقتدر شخصیتوں کا احترام کرتے رہے۔ ان کی کوشش یہ رہی کہ ان میں اور بیوروکریسی کے کرتوں دھرتوں کے مابین سوچ خواہ مقاصد کے لحاظ سے اختلاف تو درکنار کوئی ظاہری بعد بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ ہر منزل پر وہ بیوروکریسی کے ارباب ثلاثہ (غلام محمد مرحوم' اسکندر مرزا مرحوم' اور چودھری محمد علی مرحوم) کے ممد و معاون رہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا اندازہ یہ ہو کہ چونکہ وقت کا دھارا عوامی اور جمہوری تصورات کے خلاف چل رہا ہے تو ایسے حالات میں آدمی "پاور" کے منابع سے مل کر ہی کچھ لے سکتا ہے اور کچھ دے سکتا ہے۔ اگر ان کی سوچ یا ان کے عمل کے یہ انداز نہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ان کے تعاون کے بغیر نہ غلام محمد ناظم الدین کو ڈسمس یا دستور ساز اسمبلی توڑ سکتے تھے نہ اسکندر مرزا صدر مملکت یا چودھری محمد علی

وزیراعظم بن سکتے تھے۔ نہ ون یونٹ وجود میں آسکتا تھا نہ مسلم لیگ توڑنے اور ری پبلکن بنانے والا اسکندری منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ غرض نوکر شاہی کا وہ سارا کاروبار 1957ء تک چلا اور جو آگے چل کر پاکستان کے لیے مستقل پریشانیوں کا موجب بنا' ہرگز پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

مگر نواب صاحب مرحوم کو نوکر شاہی کے ساتھ اس قدر تعاون کرنے کا صلہ کیا ملا؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے ہی نوکر شاہی کے اپنے پاؤں مضبوط ہوئے' اس نے نواب صاحب کو اس طرح نکال کر باہر پھینک دیا جس طرح دودھ سے مکھی کو نکالا جاتا ہے۔

شروع 1957ء تک نوکر شاہی نے نواب صاحب سے اپنے سب کام نکال لیے تھے۔ اسی اثناء میں اس کے یہاں نواب صاحب کی حد سے زیادہ آؤ بھگت ہوتی رہی تھی۔ ہر اچھے برے کام میں نواب صاحب کو آگے رکھا جاتا تھا۔ ان کے مشورہ یا منظوری کے بغیر لتاڑ پچھاڑ کا کوئی پروگرام نہیں بنتا تھا۔ خود نواب صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ نوکر شاہی اب ان کی محتاج بن چکی ہے اور ان کے تعاون سے بغیر وہ ایک قدم آگے نہیں چل سکتی۔

دوسری طرف نوکر شاہی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ نواب صاحب اب اس قدر طاقتور بن گئے ہیں کہ اگر ان کو اس وقت نہیں ہٹایا گیا تو آگے چل کر وہ اس کے عزائم کے لیے خطرہ کا باعث بن جائیں گے اور جس وقت چاہیں گے ان کو نکال کر خود اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کر لیں گے۔

انہی دنوں چند مہینے بعد نواب صاحب کراچی تشریف لائے۔ اسکندر مرزا (صدر) کے مہمان بنے' صدارت محل کے شاہی کمرہ میں ان کو رکھا گیا جہاں بادشاہوں کے بغیر کوئی اور نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ یہ بڑا اعزاز تھا جو نواب صاحب نے سمجھا کہ ان کو بخشا جا رہا ہے' ان کو اور یقین ہو گیا کہ اب ان کی پوزیشن لازوال ہے حالانکہ یہ ساری ٹھگی اور منافقت تھی' وہ اسکندر مرزا کو جانتے تو تھے مگر غالباً کافی نہیں جو کچھ ان سے عنقریب ہونے والا تھا اس سے وہ قطعاً بے خبر تھے۔

میرا نواب صاحب سے ایک بات پر اختلاف رہا' میں ان کی گورنری کو مغربی پاکستان کے لیے اور خود ان کی اپنی سیاسی صحت کے لیے مضر سمجھتا تھا۔ میری نظر میں

انہوں نے یہاں کی سیاست کو کرسی پر بیٹھتے ہی ایسے چکر کھلائے تھے کہ ساری سیاسی فضا مکدر اور غیر یقینی بن گئی تھی (یہ میری اپنی سمجھ کا معاملہ ہے' ہو سکتا ہے کہ میری اس رائے سے دوسروں کو اختلاف رہا ہو۔)

مگر اس قدر شدید اختلاف کے باوجود ان کی انتہائی وضع داری کی بدولت ہمارے ذاتی مراسم میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ جب بھی کراچی آتے تھے' یا میں لاہور جاتا تھا تو آپس میں ملتے تھے اور گھنٹوں ہماری باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اکثر گیارہ بجے رات کو یہ باتیں شروع ہوتی تھیں اور صبح چار پانچ بجے تک جاری رہتی تھیں۔ ان ملاقاتوں کی یادیں میری زندگی کا دلچسپ سرمایہ ہیں۔

اس موقع پر وہ کراچی تشریف لائے تو حسب دستور مجھے بھی اپنے یہاں بلالیا' مجھ سے ملنے کی غرض سے وہ صدارتی محل سے نکل کر موجودہ عبداللہ ہارون روڈ پر اس کوٹھی میں آگئے جو اس زمانے میں مغربی پاکستان کے گورنر کی رہائش کے لیے مخصوص تھی۔ گیارہ بجے یہ محفل شروع ہوئی اور دیر تک قائم رہی۔ سردار امیر اعظم خان مرحوم بھی موجود تھے۔

اثناء گفتگو' خبر نہیں نواب صاحب کو کس طرح یہ خیال آیا کہ یکایک وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میری نظر میں ان کا مستقبل اب کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے عرض کیا: ''آپ سیاسی طور پر اس قدر طاقتور بن گئے ہیں اور اس قدر آپ کی پذیرائی ہو رہی ہے اور خود آپ نے اپنی پوزیشن اور اہمیت کی اس قدر نمائش کی ہے کہ اب آپ کو مزید وقت برداشت نہیں کیا جائے گا۔ یہ جو آج کل آپ کی اتنی خاطر تواضع ہو رہی ہے تو وہ اس طرح کی ہے جس طرح پرانے زمانے کے بادشاہ اپنے رقیبوں اور حریفوں کو دعوت دے کر اپنے یہاں بلا کر پہلے کھانا کھلاتے تھے اور پھر اسی وقت ان کی گردن مروا دیتے تھے۔ غالباً آپ اس زعم میں ہوں گے کہ چونکہ آپ نے ان لوگوں کی بڑی خدمت کی ہے' اس وجہ سے آپ کے احسان مند رہیں گے تو یہ قیاس بھی غلط ہے کہ ایک انگریزی کہاوت ہے کہ:

"GRATITUDE HAS NO PLACE IN THE DINAMICS OF POWER POLITICS."

(اقتدار کی جنگ میں احسان مندی کے جذبہ کا کوئی مقام نہیں۔)

ان لوگوں نے (یعنی مرکزی نوکر شاہی نے) اب تک آپ سے اپنے کام نکال لیے ہیں۔ وہ ساحل مراد کو پہنچ چکے ہیں۔ اب ان کو کشتیوں کو جلا دینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ وہ اب آپ کے بوجھ سے بھی اپنے کو سبکدوش کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ آپ ان کے مستقبل کے سفر میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کے قابل نہ رہیں۔"

میری یہ بات سن کر نواب صاحب مرحوم اپنا سر تو دھنتے رہے اور حقے کے کش بھی لگاتے رہے مگر میں نے محسوس کیا کہ ان کو ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو یہ شک بھی ہو گزرا ہو کہ چونکہ میں خود مرکزی کابینہ سے مستعفی ہو کر باہر آ گیا تھا' لہٰذا اب میں یہی چاہوں گا کہ دوسرے بھی میری طرح بددل ہو کر' برسر اقتدار پارٹی سے جدا ہو جائیں اور اس نیت سے میں ان کو آج خواہ مخواہ ڈرا رہا ہوں۔

مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ نواب صاحب ابھی کراچی سے لاہور پہنچے ہی تھے کہ ان کو حکم ملا کہ فوراً واپس کراچی آ جائیں۔ واپسی پر وہ جیسے ہی صدر اسٹیشن پر اترے وہیں امیر اعظم خان مرحوم یہ حکم لیے کھڑے تھے کہ ان سے اسی گھڑی گورنری سے استعفیٰ کا لیٹر لکھوا لیا جائے۔ حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ نواب صاحب آئے تھے گورنر کے سیلوں میں اور واپس گئے بہ طور ایک معمولی مسافر کے!

اسکندر مرزا نے اس موقع پر یا اس کے بعد ان کا منہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

گورنری سے سبکدوش ہو جانے کے بعد نواب صاحب مرحوم پچیس سال بقید حیات رہے مگر پھر کبھی ملکی سیاست میں قدم رکھنے کا موقع نہیں ملا۔ چودھری محمد علی مرحوم تو پاور سے نکلنے کے بعد بھی کچھ تگ و دو کرتے رہے...... مثلاً مسلم لیگ کو چھوڑ دیا...... بنگالی نظام اسلامی پارٹی میں داخلہ لے لیا...... گاہے گاہے اخباری بیان جاری فرماتے رہے...... ایک آدھ کتاب لکھ ڈالی...... سیاستدانوں کی کانفرنسیں بلائیں...... ایوب کی راؤنڈ ٹیبل میں شریک ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ اور پھر بھی جب کوئی کام نہ بنا...... یعنی نہ ڈکٹیٹر گئے' نہ جمہوریت میں جان آئی...... تو داڑھی رکھ لی اور یاد اللہ میں مصروف ہو گئے۔ یہ مسافت طے کرنے میں ان کو کچھ سال لگ گئے۔

اس کے برعکس نواب صاحب نے گورنری سے نکلتے ہی داڑھی رکھ لی تھی اور

سیاست سے کنارہ کش ہو کر کھیتی باڑی میں لگ گئے تھے۔ غالباً انہوں نے آنے والے زمانے کے مزاج' تقاضوں اور مصلحتوں کا بہتر اندازہ لگا لیا تھا۔ ویسے بھی جب چڑیاں کھیت چگ کر صاف کر گئی تھیں تو ہاتھ ملنے سے کیا ہوتا تھا۔ غریب عوام کی طرف نہ کبھی دیکھا تھا نہ اب دیکھ سکتے تھے۔ ڈرائنگ روم کی سیاست ڈرائنگ روم میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ عوامی کارکن تھے ہی نہیں کہ ان کی ہمدردی میں عوام راستوں پر نکل آتے۔ وہ اسٹیٹس مین تھے اور اسٹیٹس مینوں کی یہاں کیا قدر؟ سارا وقت بیورو کریسی کی سکھ شاہی سے ہی واسطہ رہا تھا اور اسی نے آخر میں ان کا سیاسی جھٹکا کر دیا۔

حکومتوں اور قیادتوں کو نوکر شاہی کس طرح فیل کرتی رہی

نوکر شاہی کے کردار پر پچھلے دنوں بہت کچھ لکھ چکا ہوں' البتہ اس کا ایک پہلو اس وقت نمایاں نہیں کر سکا تھا جس کمی کو اب پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ یہ موضوع مکمل طور پر عوام اور مستقبل کے مورخوں کے سامنے آ سکے۔ میں جانتا ہوں کہ عوام بے چارے اس بارے میں خود کچھ نہیں کر سکتے مگر ریکارڈ ٹھیک رکھنا ہر حال میں سود مند ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے عوام کی آئندہ نسلیں اس سے بہتر پوزیشن میں ہوں اور وہ اگر چاہیں تو ہمارے تجربات کے اس ریکارڈ سے کچھ استفادہ کر سکیں۔ میرے لیے یہ تصور ہولناک ہے کہ ہمارے عوام نسل بعد نسل' غور و فکر اور عمل کے لحاظ سے بے کار رہیں گے۔

یہ شروع زمانے کا ذکر ہے۔ قائدین کے انتقال کے بعد کے ادوار کا۔

جس طریقہ سے اس ملک کی نوکر شاہی کی تشکیل یا ترتیب ہو چکی تھی اس کے خصوصی مقاصد اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ کوئی حکمران قیادت زیادہ وقت اطمینان سے چلتی رہے یا اس کے عمل سے عوام خوش رہیں۔ یہ بات بروقت سمجھ میں آنی چاہیے تھی۔ ظاہر تھا کہ نوکر شاہی کی اپنی گرفت اور قوت میں اضافہ کی رفتار اس صورت میں ہی قائم رہ سکتی تھی جب حکومتیں گھڑی گھڑی بدلتی رہیں اور جتنا وقت وہ اقتدار میں رہیں بھی تو ان کی حالت اس قدر پتلی ہو کہ نوکر شاہی آسانی سے ان کی ناک میں نکیل ڈال کر اپنی منشا اور اپنے پلان کے مطابق چلاتی رہے۔ یہی وجہ تھی کہ

جب سے پاکستان بنا کوئی حکمران قیادت دو تین سال سے زیادہ برسراقتدار نہیں رہ سکی اور اگر اس نے زبردستی زیادہ عرصہ رہنے کی کوشش بھی کی تو بالآخر وہ اس قدر ذلیل ہو کر نکلی کہ الامان و الحفیظ۔ البتہ اگر کوئی عنصر اس دار و گیر کے دوران بھی مستحکم اور غیر متزلزل رہا تو وہ یہی نوکر شاہی تھی جس کا بول ہر دور میں بالا ہی رہا۔

اور یہی وجہ تھی کہ شروع سے عوام کو ہمیشہ حکمران قیادتوں سے شکایتیں رہیں..... اور یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا..... اور عوام کی تکالیف میں حکومتوں کے بدلنے سے کبھی کوئی خاص فرق نہیں آ سکا۔

اصلی بات یہ تھی کہ جب مرض کی تشخیص ہی صحیح نہیں ہو سکی تو اس کا علاج کیا ہو سکتا تھا؟ پاکستان کا اصلی مرض یہ نوکر شاہی اور اس کا مخصوص مزاج رہا' جس کی طرف افسوس ہے کہ اب تک کسی کا خیال نہیں جا سکا۔

میں اس تحریر کے اصل مقصد پر آنے سے پہلے یہ تحقیق کر دینا چاہتا ہوں کہ نوکر شاہی کے سب آدمی بلا تحقیق خراب نہیں تھے کچھ اچھے بھی تھے۔ ہر چند کہ وہ اس قدر اقلیت میں تھے کہ وہ کسی شمار اور قطار میں نہیں تھے۔ وہ غریب گمنام گوشوں میں پڑے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ کسی سازش یا اقتدار کی ہوس میں مبتلا نہیں تھے۔ خدا ایسے لوگوں کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے اس قوم اور ملک کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اصل خرابی ان لوگوں نے پھیلائی جو اس ملک کو نوکر شاہی کی ریاست بنانا چاہتے تھے اور بنا کر چلے گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ایسی روایات بھی چھوڑ گئے کہ وہ بعد میں بھی چلتی رہیں یعنی بعد کی بیوروکریسی بھی اس پر عمل کرتی رہی۔

مسئلہ یہ ہے کہ وہ کیا طریقے تھے جن سے نوکر شاہی نے یہ صورتحال پیدا کی کہ کوئی حکومت مستحکم نہیں رہ سکی اور ہر صاحب اقتدار حکمران بالآخر بے آبرو ہو کر نکلتا رہا۔

سب سے پہلے تو نوکر شاہی کے لوگ حکمران کی نبض دیکھتے تھے۔ یہ لوگ خود بڑے نباض اور ماہر نفسیات ہوتے تھے۔ گھوڑے کی طرح سوار کے زین پر بیٹھتے ہی تاڑ لیتے تھے کہ یہ شخص سواری کا فن جانتا بھی ہے یا نہیں؟ اس کی صلاحیتیں کیا ہیں؟ اس کی خواہشات کیا ہیں؟ اس میں اپنا کچھ دماغ بھی ہے یا وہ محض کسی حادثہ کی وجہ سے

اتفاقیہ اوپر آ گیا ہے؟ انتظامی کام کا کچھ تجربہ بھی رکھتا ہے یا اس معاملہ میں بالکل نون غنہ ہے؟ اس کی کمزوریاں کیا ہیں؟ کیا وہ مستقل طور پر پاور میں رہنا چاہتا ہے؟ کیا اس کے کچھ اصول بھی ہیں؟ یا اصولوں کی حدبندیوں سے وہ کسی حد تک بے نیاز ہے؟ کیا وہ ذاتی پذیرائی چاہتا ہے؟ پیسہ بٹورنا چاہتا ہے؟ اقربا پروری کرنا چاہتا ہے؟ بعض صنعتکاروں سے سازباز کر کے' ان کو فوائد دے کر ان سے کچھ حصہ لے کر باہر کے بینکوں میں خفیہ طور پر جمع کروا دینا چاہتا ہے؟ کیا اس کو مذہبی خبط لگا ہوا ہے؟ کیا وہ محض پاور کا بھوکا ہے؟ اس کے معتمد اور مقرب اور پس پردہ مشیر کون ہیں؟

غرض ان سب چیزوں کا اندازہ لگا لینے کے بعد وہ یہ طے کرتے تھے کہ اس سے کیسا سلوک کیا جائے؟ اور اس کے مطابق ہی وہ اس کو "ہینڈل" کرتے تھے۔

عام طریقہ یہ تھا کہ ان کا ایک گروپ وقت کی مرکزی شخصیت کے قریب آ کر اس کے اردگرد گھیرا ڈال دیتا تھا اور اس کا خوشامدی اور درباری بن جاتا تھا۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد وہ اس کو یہ تاثر دیتا تھا کہ یہ لوگ اس کے ذاتی مداح' فدائی اور سرفروش سپاہی ہیں۔ ہر حکمران کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کے کچھ "خاص آدمی" ہوں اور یہ اس کے خاص آدمی بن جاتے تھے۔

"خاص آدمی" بن جانے کے بعد ان کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ (1) وہ ہر وقت اس کو یقین دلاتے رہتے تھے کہ ملک کے اندر ہر کام ٹھیک چل رہا ہے۔ (2) اس کی ذاتی مقبولیت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ (3) البتہ اس کے تھوڑے سے ذاتی دشمن ضرور درپے آزار ہیں اور ان کا قلع قمع کر دینا ضروری ہو گا۔ (4) اس کو اقتدار میں عوام نے نہیں بلکہ خود خدا نے لایا ہوا ہے۔ (5) وہ بے پناہ دماغی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ (6) اس کی کوئی سوچ غلط نہیں ہو سکتی۔ (7) عوام کی مجال نہیں کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل نہ کریں یا اس کی بنائی ہوئی پالیسیوں پر نہ چلیں۔ کیونکہ خدا نے ان کو (عوام کو) بنایا ہی اس لیے ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے اولی الامر کی اطاعت کریں۔ (8) یہ خدا کا فیصلہ اور حالات کا تقاضا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے' اس کرسی پر جما رہے۔ (9) عوام میں کوئی دم یا اپنے حقوق کا کوئی احساس نہیں ہے لہٰذا ان کو آسانی سے ڈنڈے کے زور سے چلایا جا سکتا ہے۔ (10) یہ موقف بالکل غلط ہے کہ آزادی کا پھل ہر شہری تک پہنچنا

چاہیے۔ آزادی کا پھل کھا لینا صرف چند طاقتور لوگوں کا ہی حق ہے بے طاقت عوام کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ تالیاں بجاتے اور زندہ باد کے نعرے لگاتے پھریں۔ (11) حکومت بغیر دولت نہیں چل سکتی ہے اور یہ دولت لوگوں پر ٹیکس اور محصول لگا کر آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ (12) عوام کی منتخب اسمبلیوں و سمبلیوں کا جھمیلا سرے سے غلط ہے (جن کو خدا خود مقرر کرے وہ اسمبلیوں یا عوام کے محتاج کیوں ہوں؟) البتہ اگر رسمی یا غیر رسمی طور پر کسی وجہ سے یہ اسمبلیاں گلے پڑ گئی ہوں تو ان کے ممبروں کو ڈرا دھمکا کر یا کچھ مراعات اور ذاتی فوائد دے کر اس قدر بے کار بنا دیا جائے کہ وہ اپنا اصلی اور صحیح فرض نہ بجا لا سکیں۔ (13) اندرون ملک یا سرحدوں پر کچھ ایسے جھگڑے جاری رہیں جن کی طرف لوگوں کا خیال لگا رہے اور وہ گھر کے متعلق یا اپنے حقوق کے بارے میں کچھ نہ سوچ سکیں۔ (14) وزیر' مشیر' اور کارندے ایسے رکھے جائیں جن کی اپنی کوئی جڑ یا اپنا کوئی اصول نہ ہو۔ وہ چمچہ مزاج اور مزدور طبیعت ہوں' جس کا کھائیں اس کا گاتے رہیں۔ (15) ابلاغ عامہ کے ذرائع پر قبضہ اور اخبارات کو کرپٹ کر دینا بالکل جائز ہے۔ (16) عوام گیلی مٹی کی مانند ہیں ان کو جس سانچے میں ڈال کر جو شیپ دینا چاہو دے سکتے ہو۔

یہ پٹیاں پڑھانے کے بعد وہ حکمرانوں کو بوتل میں اتار لیتے تھے اور جو چاہتے تھے ان سے کرا لیتے تھے۔ اسلام آباد باقی ملک سے کٹا ہوا شہر تھا۔ وہاں اس کا (حکمران) عام لوگوں سے ملنا جلنا یا ان کے ذریعے صحیح حالات معلوم کرنا ناممکن تھا۔ یہی نوکر شاہی کے چند درباری تھے جو اس کو اپنے گھیرے میں لیے رہتے تھے اس کی آنکھیں اور اس کے کان ہوتے تھے۔ جھوٹی رپورٹیں اور غلط نوٹ دیتے رہتے تھے۔ ایوب خان مرحوم اور یحییٰ خان مرحوم کے دماغوں پر ان طریقوں سے حاوی پڑ جانے کے بعد ان کو دو خاص سبق پڑھائے۔ ایوب خان سے آئے دن کہتے رہتے تھے کہ انہوں نے خواب میں خود سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیکھا ہے اور وہ انتہائی شفقت سے ایوب خان کے سر پر اپنا ہاتھ مبارک رکھے بیٹھے تھے۔ اس خواب بنی اور بشارت کا اثر یہ ہوا کہ ایوب خان مرحوم سچ مچ سمجھنے لگا کہ وہ مامور من اللہ ہے اور نہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہو سکتی ہے اور نہ ملکی عوام ہی اس کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ آگے چل کر اس کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ

خود قائداعظمؒ کی ہمشیرہ سے الجھ گیا اور نوکر شاہی اور چمچوں کی مدد سے ان کو شکست دے کر "عشرہ اصلاحات" منانے لگا۔ (2) یحییٰ خان مرحوم نسبتاً اور بھی سادہ لوح انسان تھا۔ اس کے دل میں یہ ہوس پیدا کی گئی کہ چونکہ وہ بندوقی پارٹی کا سربراہ ہے اس لیے اس کو ہی یہ حق ہے کہ وہ ملک کا بھی سربراہ بنا رہے۔ خیال یہ تھا کہ انتخابات کے بعد وہ مختلف پارٹیوں اور گروہوں کو آپس میں لڑا کر آسانی سے خود سربراہ بن جائے گا مگر بدقسمتی سے یہ پلان اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا کہ تنہا مجیب مرحوم کی پارٹی اکثریت میں آگئی اور اس کو روکنے کے لیے جمہوری PROCESS کو توڑ کر مشرقی پاکستان میں خون خرابہ کرایا گیا جس کا نتیجہ دنیا نے دیکھ لیا جتنے کروڑ روپے صنعتکاروں سے لے کر پارٹیوں اور گروہوں میں تقسیم کیے گئے تھے وہ سب رائیگاں گئے۔

پس میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایوب خان مرحوم بذات خود خراب آدمی تھا نہ غریب یحییٰ خان' یہ ساری کارستانی ان کے درباری چمچوں اور مشیروں کی تھی جنہوں نے ان کو گمراہ کر کے ان غلط راستوں پر چلایا اور یہ مشیر اور یہ درباری اور یہ چمچے اکثر نوکر شاہی کے لوگ تھے جنہوں نے کبھی ان غریبوں سے سچ نہیں بولا' کبھی ان کو صحیح حالات نہیں بتائے' کبھی ان کو صحیح مشورہ نہیں دیا' ویسے تو ترکی کے مصطفیٰ کمال مرحوم بھی فوجی آدمی تھے مگر ان کا انجام اس وجہ سے اچھا رہا کہ ان کو ہمارے لوگوں جیسے مشورہ بازوں سے کام نہیں پڑا۔ ان کے مشیر تھے تو عصمت انونو کے پائے کے مدبر اور اسٹیٹس مین!

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ نوکر شاہی کی بنیادی پالیسی یہ ہوتی تھی کہ کسی حکومت یا کسی خاص حکمران کو زیادہ وقت برسر اقتدار رہنے اور مستحکم ہونے نہ دیا جائے تاکہ جلد' جلد کی ردوبدل سے ہر موقع پر ان کو اپنا ایک قدم اور آگے بڑھانے کا موقع ملتا رہے۔ یعنی یہ سب پاور کا کھیل ہوتا تھا جس میں کسی وفاداری' خداترسی' راست گوئی یا حب الوطنی کے لیے گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ EVERYTHING IS FAIR IN LOVE & WAR یہ کھیل یا لڑائی دفتروں کے اندر کھیلی جاتی تھی۔ باہر والوں کو خبر نہیں ہوتی تھی کہ درون خانہ کیا ہو رہا ہے۔

بالآخر جب ذہنی طور پر نوکر شاہی' کسی حکومت یا حکمران سے اکتا کر' اس کو

چلتا کر دینے کا فیصلہ کر لیتی تھی تو اس کے خلاف دو طرف سے حملہ ہو جاتا تھا۔

(1) ایک طرف وہ اندر والا حملہ ہوتا تھا یعنی حکمران کو اندھیرے میں رکھا جاتا تھا اور اس کو گمراہ کر کے اس سے ایسے کام کرائے جاتے تھے جن کی وجہ سے وہ مخلوق خدا میں غیر مقبول اور بدنام ہو جائے۔ یہ لوگ جو فائلوں پر اس کے ملاحظہ کے لیے نوٹنگ کرتے تھے' تاویل اور توجیح کے فن کے بڑے ماہر ہوتے تھے۔ ہر خراب واقعہ' ہر حادثہ کو وہ کاغذ پر امید افزا ثابت کر کے دکھاتے تھے۔ جہاں ویسے بات نہ بن رہی ہو تو وہاں وہ اعداد و شمار کے ایسے انبار لگا دیتے تھے کہ پڑھنے والے کا سر چکرا جاتا تھا اور وہ چپ چاپ دستخط کر کے جان چھڑا لیتا تھا۔ مثلاً بات ہو کسی اپنے شہر یا صوبہ میں کثرت جرائم کی تو وہ اس حقیقت کو OUT OF FOCUS کر دینے کے لیے شکاگو کے جرائم کے اعداد و شمار لے آتے تھے یعنی سوال از آسمان جواب از ریسماں۔

(2) دوسری طرف ملک میں افراتفری پھیلانے کی غرض سے اوپر کے کارپرداز نیچے کی انتظامیہ کی رسی ڈھیلی کر دیتے تھے تاکہ نفسیاتی ڈسپلن (جس کے بغیر کسی انتظامیہ کا اچھی طرح سے چلنا ممکن ہی نہیں تھا) ختم ہو جائے۔ ہر سرکاری کارندہ شتر بے مہار بن کر رشوت لینے اور لوگوں کو پریشان کرنے میں مصروف ہو جائے۔ قانون اور ضابطہ کی گرفت ہر لبوں پر ڈھیلی پڑ جائے جہاں دیکھو لوٹ مار' بدنظمی' مار دھاڑ اور ہُو کا عالم ہو...... اور عوام ہر چیز کا ذمہ دار وقت کے مرکزی حکمران کو قرار دے کر اس کو کوستے اور بددعائیں دیتے پھریں۔ حالانکہ اس غریب حکمران کے کانوں تک یہ خبر پہنچنے ہی نہیں دی جاتی تھی کہ ملک میں فی الحقیقت کیا قیامت بپا ہو چکی ہے۔ شخصی حکومت کی خرابی یہ تھی کہ انتظامی ذمہ داریاں' منتشر اور منقسم نہیں ہوتی تھیں اور ساری ذمہ داری اچھائی یا برائی کی' ارتکاز اختیار کی وجہ سے' اس ایک شخص پر آتی تھی اور عوام اس کو ہی کوستے اور گالیاں دیتے رہتے تھے مثلاً کسی کارندے نے رشوت لے لی...... یا تھانیدار نے کسی بے گناہ سے زیادتی کر دی اور جھوٹا مقدمہ بنا دیا یا بجلی والوں نے کرنٹ بند کر کے ایک سارے علاقے

کو اندھیرے میں ڈبو دیا...... یا ڈاکخانہ والے نے منی آرڈر کی رقم خود کھالی...... یا تار بابو نے تار وقت پر نہیں پہنچایا...... یا ہسپتال سے ڈاکٹر غائب رہا اور مریض مر گیا...... یا پی ڈبلیو ڈی والوں نے ٹھیکیداروں سے مل کر منظور شدہ رقم خورد برد کر لی اور راستے یا اسکول کی عمارت نہیں بنی...... سرکاری ٹرانسپورٹ کے ڈرائیور نے نشہ پی کر بس چلائی' بس کھڈ میں گر گئی اور کئی مسافر مفت جاں بحق ہو گئے...... یا پولیس میں منتقلی کا رواج پڑ گیا اور اس رقم کو پیدا کرنے کے لیے ان کو جرائم پیشہ لوگوں سے ساز باز کرنی پڑی اور ملک میں لوٹ مار شروع ہو گئی...... یا ضابطہ کی کارروائی کے دوران مسل بیچ میں سے گم ہو گئی کیونکہ کلرک کی مٹھی گرم نہیں ہوئی تھی اور عرضدار روتا اور گورنر اور صدر کو بے سود تاریں اور درخواستیں بھیجتا رہا...... یا جنگل والے نے لکڑیاں بیچ کر سرکاری جنگل ہی غائب کر دیا...... یا ریل کی پٹڑی کو درست رکھنے والا عملہ انسپکٹر صاحب سے کاغذ پر اپنی حاضری لگا کر آرام سے گھر چلا گیا اور پیچھے پٹڑی ٹوٹ گئی۔ ریل گاڑی گر گئی' انجن الٹ گیا' ڈبے زمین میں دھنس گئے' مسافر مر گئے اور سرکاری مال جل گیا...... یا سگنل والا گاڑی کے ٹائم پر سوتا رہا اور جب آنکھیں ملتا ہوا اٹھا تو غلط سگنل دے دیا اور دو گاڑیوں کا آپس میں ٹکراؤ ہو گیا۔ (بعد از مرگ حکام بالا تحقیق کے لیے ضرور تشریف فرما ہوتے رہے گو کہ اپنی رپورٹ کبھی شائع نہیں کی۔) یا کسی لاک اپ میں پٹائی ہوتے ہوتے کسی بدقسمت انسان کا دم نکل گیا...... یا مارکیٹ میں کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ ہوئی' بیوپاریوں نے بلیک شروع کر دی۔ دال و پیاز' گوشت اور مچھلی کے بھاؤ بکنے لگے...... یا ناقص نگہداشت کی وجہ سے پانی کے پائپ ٹوٹ گئے اور پانی کی ایک ایک بوند کے لیے شہری ترستے اور تڑپتے رہے...... غرض جو کچھ ہوتا رہا اس کا ذمہ دار ایوب خان اور بعد میں یحییٰ خان کو سمجھا جاتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ نوکر شاہی کی اپنی معنی خیز لاپروائی سے بدنظمی اس قدر پھیل گئی تھی اور عام ہو گئی تھی کہ اندرون ملک شہروں میں خواہ دیہات میں ایسا کوئی گھر نہیں رہا تھا جہاں ایوب خان یا یحییٰ خان کو ہر خرابی کا سرچشمہ سمجھ کر لوگ

بے بسی کے عالم میں ان کو بد دعائیں نہ دے رہے تھے حالانکہ شخصی طور پر وہ دونوں بے قصور تھے۔ اگر ان کا کوئی قصور تھا بھی تو صرف اس قدر کہ انہوں نے سارا اختیار اپنے ہاتھوں میں رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہر انتظامی خرابی کا جوڑ ان سے جا کر ملایا جاتا تھا۔ یہ ایک نیچرل بات تھی...... ارتکاز اختیار کی صورت میں اگر بدنظمی عام ہو جائے تو ہر الزام مرکزی شخصیت کے سر ہی تھوپا جاتا ہے۔

چنانچہ یہ حال دیکھ کر تاڑنے والے اسی وقت تاڑ گئے تھے کہ اب ایوب خان (اور بعد میں یحییٰ خان) سے نوکر شاہی اکتا گئی ہے اور بدنظمی پھیلا کر اور ان کو بدنام کر کے نکلوانا چاہتی ہے ورنہ کوئی سبب نہیں تھا کہ اوپر کی نوکر شاہی اپنا کنٹرول اس قدر ڈھیلا کر دے کہ اس کے اکثر زیردست حرام خوری اور مردم آزاری میں لگ جائیں۔

...... یہ تو خیر ہوئی کہ یہاں کے ملکی باشندے انقلاب پسند اور خون آشامی کے عادی نہیں تھے۔ ورنہ ڈکٹیٹری اور اس کے ساتھ بدنظمی کے نتائج اس سے بھی زیادہ برے ہو سکتے تھے۔

پھر نہ صرف یہ ہوا بلکہ نوکر شاہی کے درباری مشیروں نے ایوب خان مرحوم اور بعد میں یحییٰ خان مرحوم کو چند ایک اور بھی مہلک مشورے دے رکھے تھے۔

مثلاً:

(1) ایوب خان سے بی ڈی کا فراڈ کروایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غبن خورد برد اور بد دیانتی کا مرض "غیر سرکاری ملازموں" میں بھی پھیل گیا اور نچلی سے نچلی سطح یعنی GRASS ROOTS تک پہنچ گیا۔ سرکاری پیسہ تعمیری گرانٹوں کے بہانے سے اس بے دردی سے بی ڈیوں میں تقسیم ہوا کہ وہ اس کو شیر مادر سمجھ کر خود ہضم کرنے لگ گئے۔ کروڑوں روپیہ پبلک کا ضائع ہو گیا اور معاشرہ میں رشوت خوروں کی ایک نئی کلاس وجود میں آ گئی۔ آخر میں یہ بی ڈی نہ جمہوریت کی جگہ پر کر سکے نہ خود ایوب خان کے کسی کام آ سکے۔

(2) جہاں تک یحییٰ خان کا تعلق ہے تو اس میں صدارت کی ہوس پیدا کروا کر اس کو آمادہ کیا کہ وہ جمہور کے فیصلے یعنی انتخاب کے نتائج کو پس پشت ڈال کر اپنی

مرضی چلائے اور اگر ویسے نہ چلے تو تشدد سے کام لے..... نتیجہ بنگلہ دیش اور بنگلہ دیش کا سبق!

حال ہی میں شروع کی نوکر شاہی کے ایک موسس اسکندر مرزا مرحوم کا ایک پرانا انٹرویو کراچی کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ میں اس دور میں خود مرکزی وزیر تھا اور جو کچھ اندر باہر چل رہا تھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اسکندر مرزا مرحوم کی بیان کردہ ساری کہانی غلط ہے اور یہ غلط بیانی' اگر خود انٹرویو کا بغور تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ بہر حال میں انشاء اللہ پہلی فرصت میں اس طرف توجہ کروں گا۔ امید کرتا ہوں کہ تب تک قارئین کرام اس انٹرویو کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھیں گے۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ